

مہو کی شادی اور پھرامی کے انتقال کے بعد جب گھر میں صرف وہ دونوں باپ بیٹی رہ گئے تو ان دونوں ہی نے ایک دوسرے کی تنہائی بانٹنے کے لیے آپس میں بڑی اچھی انڈر اسٹینڈنگ پیدا کر لی تھی۔ جس وقت امی کا انتقال ہوا وہ بارہ سال کی تھی۔

”امی بہت شدید بیمار ہیں، وہ بستر سے اٹھ کر خود ہاتھ روم تک بھی نہیں جاسکتیں۔ شاید انہیں کوئی بہت خطرناک بیماری ہے۔“ وہ بابا اور مہو آپنی کوچھپ چھپ کر روتے دیکھ کر سوچا کرتی تھی۔ وہ لوگ اس کے سامنے امی کی بیماری کے بارے میں بات کرنے یا رونے سے ہر ممکن حد تک گریز کرتے تھے۔ پھرامی کی بیماری کے ایام میں ہی مہو کی عدیل کے ساتھ شادی

صبح خیز تو خیر وہ تھی، مگر صبح صبح واک کرنے کے لیے جانا اسے دنیا کا سب سے مشکل کام لگتا تھا۔ بابا کو اس کی اسی عادت سے شدید اختلاف تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ جب وہ صبح جلدی اٹھ ہی جاتی ہے تو پھر چہل قدمی کے لیے کھلی فضا میں نکلنے میں کیسی سستی۔ مگر یہاں شاید موسم کی خوبصورتی کا اثر تھا یا پھر وہ ویسے ہی کچھ ضرورت سے زیادہ خوشگوار موڈ میں تھی کہ گھر سے باہر نکل آئی تھی۔

باہر نکلتے ہی ہوا کے سرد جھونکوں نے اس کا استقبال کیا تھا۔ سویٹر پہننے کے باوجود سردی محسوس ہو رہی تھی۔ رات بھر ہوئی بارش کا کہیں کوئی نشان باقی نہ تھا۔ سڑکیں صاف ستھری، کہیں بارش کا پانی

فرحت اشتیاق



طے کر دی گئی تھی۔ اسے مہو آپنی کی اتنی جلدی شادی ہونے پر بہت اعتراض تھا۔

”مہو آپنی کی شادی ہو گئی تو پھر میں سوؤں گی کس کے پاس؟ میرے جرنل پر Diagrams بنا کر کون دیا کرے گا اور پھر ابھی تو مہو آپنی خود بھی پڑھ رہی ہیں۔“ وہ نہاء سے چھ سال ہی تو بڑی تھی اور چند ماہ پیشتر ہی اس کا آنر میں داخلہ ہوا تھا۔

”امی کی خواہش ہے کہ وہ اپنی زندگی میں کم سے کم اپنی اولاد کی ایک خوشی تو دیکھ سکیں۔ میرے لیے پڑھائی سے زیادہ اہم میری ماں کی آخری خواہش ہے۔“

مہو آپنی فون پر اپنی کسی دوست سے کہہ رہی تھیں

نہیں کھڑا تھا۔ یہ اس کا اسلام آباد کا تفصیلی قسم کا پہلا دورہ تھا ورنہ تو اس سے پہلے وہ امی، بابا اور مہو کے ساتھ ایک دو مرتبہ ہی یہاں آئی تھی اور وہ بھی ایک آدھ دن کے لیے۔ ”لوگ اسلام آباد کی صحیح تعریفیں کرتے ہیں۔“ اس نے برملا اعتراف کیا تھا۔ صبح بابا کا فون بھی آگیا تھا شاید اس کے موڈ کی خوشگواہی کا سبب بابا سے لمبی چوڑی گفتگو کا ہونا ہی تھا۔ وہ پہلی مرتبہ بابا سے دور ہوئی تھی اور یہ دوری اسے بہت کھل رہی تھی۔ ان تین دنوں میں کوئی لمحہ ایسا نہیں تھا جب اسے بابا کی فکر لاحق نہ ہوئی ہو۔ اگر وہ بابا کی چیمٹی بیٹی تھی تو بابا اس کے لاڈلے بابا تھے۔ دونوں ایک دوسرے کا بچوں کی طرح خیال رکھتے تھے۔

اور تب پہلی مرتبہ اسے امی کی بیماری کی شدت کا صحیح
معلوم میں اندازہ ہوا تھا۔

لوگ بیمار ہوتے ہیں پھر ٹھیک بھی ہو جاتے ہیں
پاپا کے پاؤں میں فریکچر ہوا تھا پھر وہ ٹھیک ہو
گئے تھے ایسے ہی امی بھی کچھ عرصے بعد ٹھیک ہو
جائیں گی۔ اس روز سے پہلے وہ یہی سوچا کرتی تھی۔
اس روز اسے معلوم ہوا تھا کہ ان کی بیماری کبھی بھی
ٹھیک نہیں ہوگی۔ اس کی ماں کچھ ہی دنوں میں مر



جائے گی یہ احساس کتنا خوفناک اور ڈرا دینے والا تھا۔
وہ خوف کے مارے رات کو پلک تک نہیں جھپکتی
تھی۔ رات کو کئی مرتبہ اٹھ اٹھ کر امی بابا کے کمرے
میں جھانکتی تھی پھر مہو آپنی کی شادی کے بعد اس نے
امی کا بہت زیادہ خیال رکھنا شروع کر دیا تھا۔ امی اکثر بابا
سے کہتی تھیں کہ

”نہاء“ مہو سے زیادہ سمجھ دار ہے۔ مہو میں تو ابھی
تک بچپنا ہے۔“ اور بابا اس کی طرف دیکھ کر پر شفقت
انداز میں مسکرا دیا کرتے تھے۔ پھر جس طوفان کے
آنے سے وہ سب ڈر رہے تھے وہ آکر سب کچھ بہالے
گیا تھا۔ اسے اور بابا کو نارمل زندگی شروع کرنے میں
کئی مہینے لگے تھے۔ بابا اس کی خاطر کھانے کی میز

بٹھتے اور وہ ان کا دل رکھنے کے لیے کھانا کھاتی یہ سوچ کر کہ مجھے کھانا دیکھ کر شاید بابا بھی چند تھکے نہ لیں۔ یوں رفتہ رفتہ ایک دوسرے کا خیال رکھتے رکھتے وہ ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے۔ زندگی کے بارہ سالوں میں وہ بابا کو دلتا نہیں جان پائی تھی جتنا ان چند ماہ میں جان کی محسوس اور بابا جن کے لیے ان کی دونوں بیٹیاں آٹھ کا تارہ تھیں مگر عملی طور پر بچوں کی تعلیم و تربیت بیوی کے سپرد کر کے وہ اپنے دفتری امور میں زیادہ مصروف رہا کرتے تھے اب اپنی اس لاڈلی بیٹی کی چھوٹی سے چھوٹی ہر بات اور ہر جذبے سے واقف ہو گئے تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں گمن آہستہ آہستہ زندگی کی طرف واپس آ گئے تھے۔

پچھو پچو کی پہلی کافی سالوں سے وہاں میں سیٹھ تھی اور شادی کے کچھ عرصے بعد موہو بھی اپنی سسرال دوبا چلی گئی تھی وہ اپنی شادی شدہ زندگی سے مطمئن تھی عدیل بہت چاہنے والے شوہر ثابت ہوئے تھے۔

اپنی اور بابا کی فون پر ہونے والی گفتگو ذہن میں دہرائی وہ کافی آگے نکل آئی تھی۔ یوں سڑک پر ٹہکتے بابا کی ہر لطف گفتگو یاد کر کے اسے بہت مزہ آ رہا تھا۔ بابا اس کے کام سے نہ جا رہے ہوتے تو وہ بھی ضرور ٹنگ کر ان کے ساتھ چلی گئی ہوتی۔ سڑک کے دائیں طرف مخالف سمت سے جو ٹنگ کر کے اس طرف آتے اس بندے اور اس کے ساتھ ساتھ دوڑتے اس کے کتے کو نماء نے سرسری نظروں سے دیکھا تھا۔ اپنی پوری توجہ سامنے مرکوز کیے اس نے تو شاید نماء کو سرسری سا بھی نہیں دیکھا تھا مگر اس کے کتے کو یکایک پتا نہیں کیا ہوا تھا کہ وہ اپنے مالک کو چھوڑ کر ایک دم سڑک کے بائیں طرف اس کے بالکل نزدیک آ گیا تھا۔ اپنے سامنے کتے کو آتا دیکھ کر نماء کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ کتوں سے ایسا وہ نہیں وہ ٹھیک ٹھاک ڈرتی تھی۔ اس نے بے اختیار رخ موڑ کر اگلے قدموں تیز تیز چلنا شروع کر دیا تو کتا ڈور تا ہوا باقاعدہ اس کے ساتھ رہیں لگائے لگائے۔ بے ساختہ انداز میں اس کے منہ سے چیخ نکلی تھی۔

"اے! غصے میں ہمیں اس توانے اس کی چیخ اور کتے کے بھونکنے والوں کو خاموش کر دیا تھا۔ پس نی کھڑا حشمیں نظروں سے اپنے کتے کو گھور رہا تھا۔

"I am Sorry" اب کے مخاطب وہ تھی۔ نماء نے اپنے حواس بحال کرتے ہوئے کتے کی طرف دیکھا تو وہ مالک کی ڈانٹ کھانے کے بعد ایک طرف کونے میں جا کر کھڑا ہوا نظر آیا۔

"دوڑے آپ خواہو ڈر گئیں۔ دل آپ کے پیچھے نہیں آ رہا تھا۔ ہاں البتہ آپ کے بھاگنے والے اسٹائل سے وہ سمجھا کہ شاید آپ اس کے ساتھ رہتنگ کر رہی ہیں اس لیے وہ بھی دوڑنے لگا۔"

شانست لمحے میں معذرت کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے کتے کی "غیر اخلاقی" حرکت کا وقار بھی کیا تھا۔ نماء کو غصہ تو بہت شدید آ رہا تھا مگر ایک تو اپنی لڑائی جھگڑے سے دور رہنے والی عادت اور دوسرے سامنے والے بندے کا حد درجہ شانستہ انداز کسی بھی بدتمیز سے روک رہا تھا۔ اپنے خدوخال سے وہ ایشیائی تو لگ رہا تھا مگر پاکستانی ہرگز نہیں۔ اس کی گاڑھی قسم کی انگشٹ امریکن لب ولہو لیے ہوئی تھی۔ وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھا یقیناً "جواب کا منتظر تھا۔

"کوئی بات نہیں" کہتی وہ زبردستی مسکرائی تھی۔ غیر ملکیوں کے سامنے ہم اپنے ملک کے سفیر ہوتے ہیں کیا فائدہ کچھ التماسدہا ہونے کا وہ بھی کیا سوچے گا کہ یہ پاکستانی کتے ڈر پوک اور بدتمیز ہوتے ہیں نماء نے سوچا تھا۔ وہ دوستانہ مسکراہٹ اس کی طرف اچھال کر "تم ان دل" کہتا دیکھو جو ٹنگ شروع کر چکا تھا۔ نماء نے ایک نظر مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور اپنے قدم واپس گھر کی طرف موڑ لیے۔

گھر پہنچی تو ٹوبہ آئی پکن میں تھمی ناشتے کی تیاریوں میں مصروف تھیں جبکہ انکل اخبار کا مطالعہ کر رہے تھے۔

"آج تو بچہ صحت بنا کر آ رہا ہے۔" اس کے سلام کے جواب میں انکل نے شوخی سے کہا تھا۔

"بہت برا سلوک ہو رہا ہے ناں یہاں تمہارے ساتھ۔ بھائی صاحب بھی کیا سوچ رہے ہوں گے کہ پتا نہیں تین چار دن میں ہی ظالم سالی اور اس کے شوہر نے میری بیٹی کے ساتھ کتنا ظلم و ستم کیا ہے جو وہ یوں بیزار ہو رہی ہے۔"

"ایسی بات نہیں ہے آنٹی۔ آپ کو تو پتا ہے ناں میں پہلی مرتبہ بابا سے دور ہوئی ہوں۔ ورنہ آپ لوگوں کے پاس تو بہت مزہ آ رہا ہے۔" وہ ایک دم وضاحتی انداز میں بولی تھی۔

"تم بھی کس کی باتوں میں آ رہی ہو۔ یہ تمہاری خالہ جان ایسی جذباتی بلیک میلنگ میں ماہر ہیں۔" انکل نے اسے مخاطب کیا تھا۔ ایسی بلیک پھلکی گفتگو میں ناشتا تمام ہوا تھا۔

ناشتے کے بعد انکل اور ٹوبہ آئی اپنی اجازت پر چلے گئے تو وہ کچھ دیر اخبار پڑھنے کے بعد کمپیوٹر کھول کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کے آنے کی خوشی میں ٹوبہ آئی تین چار دن یونیورسٹی نہیں گئی تھیں۔ مگر چونکہ وہاں امتحانات چل رہے تھے اس لیے مزید چھٹیاں کرنا ممکن نہ تھا پانچ اس کے آنے کے بعد آج وہ پہلے دن یونیورسٹی گئی تھیں۔ نھیالی رشتے داروں میں اسے ٹوبہ آئی سب سے زیادہ پسند تھیں۔ ان کی والدانہ محبت اسے امی کی یاد دلاتی۔ اسے ان کے بس میں امی کی خوشبو محسوس ہوتی تھی۔ امی کے انتقال کے بعد سے کوئی سال ایسا نہیں گزرا تھا جب انہوں نے اپنی مصروف زندگی میں سے ہفتہ دس دن نکال کر اس کے ساتھ کراچی میں نہ گزارے ہوں۔ اسے اور مو کو ساگرہ پرورش کرنا اور عمید پر جوڑا بھجوانا وہ کبھی نہیں بھولتی تھیں۔ اسے اونز ہو کر اپنی یہ اسماٹ اور تنگ سی خالہ بہت پسند تھیں۔ ان کی شوخ و شریر فطرت دیکھ کر کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ وہ Mathematics جیسے خشک اور مشکل مضمون کی لیکچرر ہیں۔

بابا کو امی میل کرنے کے بعد اس نے چیک کیا تو عدیل بھائی آن لائن تھے۔ پھر تو اس کی عدیل بھائی کے ساتھ ساتھ موہو آئی۔ پچھو پچو اور سلی سب ہی سے مصنوعی انداز میں خطی ظاہر کرتے ہوئے پوچھیں۔

"ابا! مطلب؟" اس کے باہر نکلتے ہی انکل نے بے کالی سے پوچھا تھا۔ چائے کی کیشل ٹیبل پر رہتی ٹوبہ آئی نے بھی پوچھ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ اس نے ہلے کے انداز میں سارا واقعہ سنایا تو ٹوبہ آئی اور انکل دونوں ہی ہنس پڑے تھے۔

"آپ لوگ ہنس کیوں رہے ہیں۔" وہ بری طرح پڑائی تھی۔

"بے وقوف وہ باتوں کیا تھا اور اگر وہ اس طرح بغیر لکچر اپنے کتے کو لے کر گھوم رہا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ کتا اچھی طرح سدا ہلایا ہوا ہے۔"

"پھر بھی کتا تو کتا ہے۔ اس کی شرافت کی قسم تو نہیں کھائی جا سکتی۔ کیا پتا کب اس کا دل بچر جائے اور وہ اپنی اصلیت پر واپس آجائے۔" انکل کی بات پر وہ پریشان کر بولی تھی اور وہ جواب میں قہقہہ لگا کر ہنس پڑے تھے۔

"بابا کا فون آیا تھا۔" کورن فلیکس کھاتے ہوئے اس نے ٹوبہ آئی کو مخاطب کیا تھا۔

"کب آیا؟"

"آج صبح۔ میری آنکھ ہی بابا کے فون کی تیل سے کھلی تھی۔ آپ لوگوں کو سلام کہہ رہے تھے۔" وہ جواب میں بولی تھی۔

"ابھی تو سینول میں ہی ہوں گے بھائی صاحب۔" انکل بھی گفتگو میں شریک ہوئے تھے۔

"جی انکل۔ بابا کہہ رہے تھے کہ ابھی انہیں ہفتہ دس دن کوریا میں لگیں گے پھر اس کے بعد تو کیو چلے جائیں گے۔ میں نے تو بابا سے صاف صاف کہہ دیا کوریا، جاپان، تھائی لینڈ، سنگا پور، جہاں جہاں جانا ہے جائیں مگر ایک مہینہ سے اوپر ایک دن بھی اگر ہوا تو میں اپنی ناراض ہو جاؤں گی۔" اس کے انداز پر انکل اور ٹوبہ آئی دونوں ہی مسکرا دیے تھے۔ پھر ٹوبہ آئی مصنوعی انداز میں خطی ظاہر کرتے ہوئے پوچھیں۔

”اے“ اسے آواز دے کر اس نے گاڑی اشارت کر لی تھی۔ نما کا دل چاہا وہ اس کی آواز کو نظر انداز کر کے وہاں سے اندھا دھند بھاگ جائے۔ اگر اپنی ذاتی گاڑی ہوتی تو شاید وہ ایسا کر بھی گزرتی۔ مگر اسے مرے قدموں سے چلتی وہ گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔

”وہیں میں اپنی غلطی پر آپ سے ایک سیکوڈ کر چکی ہوں۔“ وہ بھرائے ہوئے نیچے میں بولی تھی۔ اس کی بات کے جواب میں کچھ کے بغیر وہ گاڑی اشارت کر دیا تھا۔

”آپ کا گھر اسی گلی میں ہے ناں۔“ گاڑی مڑن کرتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔ کچھ خوف زدہ انداز میں نما نے گردن ہلا دی تھی۔

”کون سا گھر ہے؟“ ایک سیکوڈ کے توقف کے بعد رقرار کم کرتے ہوئے پوچھا گیا تھا۔

”وہ بلیک گیٹ والا۔“ گاڑی گیٹ کے پاس لاکر روکنے ہوئے نما اس کے اترنے سے پہلے اتر گیا تھا۔

”میں خاص طور پر آپ کا گھر دیکھنے کے لیے یہاں تک نہیں آیا ہوں۔ آپ اتنی زیادہ ڈری ہوئی لگ رہی تھیں کہ مجھے لگا آپ خود ڈرائیو کر کے واپس گھر تک نہیں پہنچ سکتیں اس لیے آپ کو چھوڑنے آیا۔“ اس کے اترتے ہی وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔

”میرا مقصد آپ کو ڈرانایا رلانا ہرگز نہیں تھا نما۔“ وہ اسی سنجیدگی اور ہمدردی سے بولا تھا۔ وہ بری طرح چونک گئی تھی۔

”نما؟“ اس نے تعجب سے خود اپنا نام دہرایا تھا۔

”آپ کو میرا نام کیسے پتا چلا؟“ اس کے سوال پر وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

”جاو کے زور سے۔“ وہ مسکراہٹ دیتا ہوا شرارتی انداز میں بولا تھا۔ وہ احتمول کی طرح منہ پھاڑے اسے پیدل جاتا ہوا کچھ دیر تھی۔ پونسی پے خیالی میں ہاتھ اپنی جھن پر ڈالتا اس کا اپنی عقل پر ماتم کرنے کا دل چاہا۔ اندر آکر بھی وہ کبھی ہی پور تک ایک اجنبی کے سامنے حماقتوں کے اسٹے عظیم الشان

مظاہرے کرنے پر وہ خود کو سزا دینا لگی رہی تھی۔ اس نے اپنے دل میں جھنجھکی اس کا ہاتھ پر فوراً کھینچ لیا۔ اسے اپنی حماقت کا خیال آ رہا تھا۔

رات کو سوئے وقت تک اس کے اعصاب پر وہ اجنبی ہی سوار تھا۔ اس کا انداز نما کو بہت برا سرا لاور عجیب و غریب لگا تھا۔ عام طور پر اس قسم کے حالات میں یا تو لوگ سامنے والے سے لڑنے اور برا بھلا کہنے کھڑے ہو جاتے ہیں یا پھر بڑے دل کا مظاہرے کرتے ہوئے غلطی کرنے والے کو کچھ کے بغیر جانے دیتے ہیں۔ مگر اس طرح ڈرائیو نگ کی غلطیاں ٹھیک کروانے اور ڈرائیو نگ کے اسرار و رموز سمجھانے کوئی بھی کھڑا نہیں ہوتا۔ بہت سوچنے کے بعد آخر کار اس نے یہ کہہ کر خود کو تسلی دے لی تھی کہ وہ بندہ اچھا خاصا کھڑا ہوا تھا۔ یقیناً اس کے دماغ کا کوئی اسکو ڈھیلا تھا۔

”مگر میں اس کے احکامات اتنی فرمانبرداری سے کیوں مان رہی تھی۔“ وہ اب اپنے آپ سے الجھ رہی تھی۔

”کچھ بات تھی ایسی اس کی شخصیت میں کہ میں بری طرح اس سے مرعوب ہو کر اس کے زیر اثر آ گئی تھی۔ عجیب سا رعب تھا اس کے انداز میں۔“ اس کے ذہن سے اس شخص کا اچھو اور شائستگی لیے ہوئے لمحے کا وہ حکمیہ انداز محو نہیں ہو رہا تھا۔ اکیلے گاڑی لے کر نکلنے سے تو بہر حال اس نے توبہ کر لی تھی۔ زیادہ تفصیل سے تو نہیں لیکن بات کو بہت سرسری اور عام سے انداز میں لے کر اس نے تھوڑا بہت توبہ اتنی کو بھی بتا دیا تھا۔ اس مسئلے کا حل انہوں نے یہ نکالا تھا کہ روزانہ شام کے وقت اسے گاڑی چلانے کی پریکٹس کروانے لگی تھیں۔ اسے اب اس بندے کا سامنا ہو جانے کے خیال سے گھبراہٹ ہوئی تھی۔ بہت سویر اور سنجیدہ مزاج ہونے کے باوجود اگر آپ کسی ایک شخص کے سامنے ہی کسی حماقت کا مظاہرہ کر چکے ہوں تو دوبارہ اس شخص کا سامنا کرنے میں دشواری لاحق ہوتی ہے۔ کیا وہ اجنبی شخص یہ بات بھی مان سکتا ہے

انتا کچھ لوگوں پھیلائے۔ ان کے اس سستی اور کاپلی بھرے بیان پر ابھی وہ ڈھنگ سے فہم بھی نہیں پائی تھی کہ پاس ہی ایک جالی پہچانی آواز سنائی دی۔ وہ اس سے پہلے کچھ فاصلے پر کھڑا سلیزمن سے مخاطب تھا۔

والٹ سے پیسے نکالتے ہوئے اسے شاید اپنے چہرے پر کسی کی نظرس محسوس ہوئی تھیں اسی لیے گردن کھڑا کر دیکھا تھا۔ ایک بل کے لیے ہلکی سی شیشائی لی ہوئی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی تھی۔ وہ گھبرا کر اپنی نظروں کا زاویہ بدلتے ہی والی تھی کہ وہ براہ راست اس سے مخاطب ہو گیا تھا۔

”میلو نما۔ آئیسی ہیں آپ۔“ وہی دھیمے سروں میں شستہ انگریزی بولنے والا انداز تھا۔ توبہ اتنی جو سلیزمن کے ساتھ الجھ رہی تھیں ایک دم چونک کر اسی طرف دیکھنے لگی تھیں۔ بری طرح جڑبڑھوتے ہوئے وہ بے شکل بولی تھی۔

”ٹھیک ہوں۔“ اور فوراً ہی توبہ اتنی کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

”کون ہے یہ پنڈ سم بندہ۔“ ان کی سرگوشی نما آواز اتنی بلند تو ضرور تھی کہ نما سے کچھ فاصلے پر کھڑا وہ بندہ بھی سن سکے۔

”توبہ تو بولیں۔ وہ سن رہا ہے۔“ وائٹ کچکا کر وہ بڑبڑاتی تھی۔

”واہ اسے اردو کیا سمجھ آئے گی۔ دیکھتے سے ہی غارنر لگ رہا ہے۔“ وہ کندھے اچکا کر بے فکر سے بولی تھیں۔

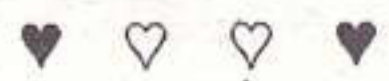
”کم سے کم پنڈ سم۔“ تو ضرور اس کی سمجھ میں آ گیا ہو گا اور اتنا اندازہ تو اسے بہر حال ہو گا کہ خوش سستی سے اس ٹیکری میں اس وقت اس کے علاوہ پنڈ سم اور کوئی نہیں۔

ٹیکری سے باہر نکلتے ہوئے وہ اپنا غصہ ظاہر کرتے ہوئے بولی تھی۔ شکر تھا کہ ان کا مطلقہ ایک فوراً ہی مل گیا تھا اور ان لوگوں کو زیادہ دیر وہاں کھڑا نہیں ہونا پڑا تھا۔ توبہ اتنی اس کے تھے ہوئے انداز پر ہلکھلا کر ہنس پڑی تھیں۔ اپنی گاڑی کے پیچھے

کھڑی اس بلیک ہجیر کو وہ بھی نہیں بھول سکتی تھی۔ اسے کم سم کھڑا دیکھ کر انہوں نے ٹوکا تھا۔
 ”کیا ہوا گھر نہیں چلنا کیا۔ چلو بیٹھو گاڑی میں۔“
 گاڑی کی چابی اس کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے وہ برابر والی سیٹ پر بیٹھ چکی تھیں۔ اسی وقت وہ بھی اندر سے برآمد ہوا تھا۔ ہاتھوں میں پکڑے دو تین شاہر زبر ابروالی سیٹ پر رکھتا وہ ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تھا۔ نہاء گاڑی میں بیٹھ کر خواجواہ بیک ویو مرر ٹھیک کرنے لگی۔

”کیا ہوا“ چلو بھی۔ دیر ہو رہی ہے۔“ توبیہ آنٹی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔
 جیسے ہی گاڑی ریورس کر کے پارکنگ سے نکالتے ہوئے وہ آگے پڑھا نہاء نے بھی فوراً ”ہی گاڑی اشارٹ کر دی تھی۔ اس گلی سے اس نے قصداً“
 گاڑی نہیں نکالی جہاں اس کا گھر تھا۔ اس کے یہ بتانے پر کہ اسی بندے اور اسی کے کتے سے وہ پندرہ روز پہلے شرف ملاقات حاصل کر کے آئی تھی وہ بہت حیران ہوئیں۔

”صبح صبح اتنا ہینڈ سم بندہ دیکھ کر تم وہ سڑا ہوا منہ لے کر گھر آئی تھیں۔ لعنت ہے تمہارے ذوق پر۔ میں تو ایسا بندہ صبح صبح دیکھ لوں تو سارا دن بیٹسی ہی اندر نہ ہو۔ پورا دن خوشگوار گزرے۔“ ان کے ان کمٹس پر اس کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا تھا۔



کتب بنی اس کا اور انکل کا مشترکہ شوق تھا۔ اپنے گھر میں پایا اور یہاں پر انکل اس کے اس شوق کی تسکین کا کافی سامان کر رہے تھے۔ اس کا شوق دیکھتے ہوئے انکل نے اپنے ذخیرہ خاص میں سے بڑی قیمتی کتابیں اسے پڑھنے کے لیے دی تھیں۔ بقول توبیہ آنٹی یہ اس کے ساتھ انکل کی جانب سے وی آئی پی سلوک کا اظہار تھا ورنہ اپنی کتابوں کے معاملے میں وہ بہت بے مروت اور کنجوس واقع ہوئے تھے۔ اس روز انکل نے آفس سے فون کر کے اسے جلدی سے تیار ہونے کا حکم دیتے ہوئے کہا تھا۔ ”بہت زبردست بک

فیئر لگا ہے تم تیار رہو میں تھوڑی دیر میں ہوں۔“ وہ بھی ایک دم پر جوش ہو کر تیار ہونے کمر میں بھاگی تھی۔

بک فیئر واقعی بہت شاندار تھا۔ مختلف اشائے عمر اور ہرزوق کے حامل قارئین کے لیے کتابوں کی تعداد موجود تھی۔ انکل اپنے پسندیدہ مضمون ہسٹری سے متعلق کتابوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ وہ مختلف اشائے دیکھتی ہوئی کافی آگے نکل آئی تھی۔ Windows اور انٹرنیٹ سے متعلق کتابیں دیکھتے ہوئے اس کا یہی دل چاہ رہا تھا کہ ساری کی ساری کتابیں خرید لے۔

”بھی میرے پاس اتنا پیسہ ہوا تو میں اپنی ایک والی عالیشان قسم کی لائبریری بناؤں گی جس میں ڈھیر ساری کتابیں ہوں گی۔ اردو لٹریچر، انگلش لٹریچر، ہسٹری فکشن، سائنس، بزنس۔ ہر موضوع پر خوب ساری کتابیں۔“

وہ ہاتھ میں پکڑی کتاب کے اوراق پلٹتے ہوئے خیالی پلاؤپکانے میں مصروف تھی جب وہ جانی پہچانی آواز اسے سنائی دی تھی۔ وہ اسی اشال پر کھڑا کسی کتاب کے متعلق پوچھ رہا تھا۔

”ہیلو“ اس کی نظر نہاء پر پڑی تو اخلاقی تقاضے نبھانے کی خاطر آج ہیلو میں پہل نہاء ہی نے کر دی تھی۔ جب وہ اچھی طرح بات کرتا ہے تو اسے بھی جواب میں اخلاق کا مظاہرہ کرنا چاہیے اس نے دل ہی دل میں خود سے کہا تھا۔

”بہت اچھا بک فیئر ہے۔ کتابوں کی قیمتیں بھی مناسب ہیں۔“ اس کے ہیلو کا جواب دینے کے بعد اس نے اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔

”جی ہاں۔“ اس نے فوراً اتفاق کیا تھا۔ اپنی مطلوبہ کتاب ہاتھ میں آنے پر وہ فوراً ہی پیمنٹ کرنا ہوا اسے ”گڈ بائے“ کہتا واپس مڑ گیا تھا۔

”ارے یہ کیا“ نہاء کی نظر اپنے پیروں کے پاس پڑے والٹ پر پڑی تو وہ چونک گئی تھی۔ ابھی ابھی یہی والٹ وہ اس کے ہاتھوں میں دیکھ چکی تھی۔ والٹ اشا

کر وہ تیز تیز قدموں سے چلتی اسی طرف آئی تھی جہاں وہ جاتا نظر آیا تھا۔ وہ پارکنگ میں سے اپنی گاڑی نکال رہا تھا۔ نمائے اسے دور سے دیکھ لیا تھا۔

”بات سنیں یہ آپ کا والد ہاں گر گیا تھا۔“ وہ زور سے چلائی تھی مگر ایسا لگ رہا تھا کہ شاید اس کی آواز اس تک پہنچی ہی نہیں۔ وہ تیز رفتاری سے گاڑی نکال کر جا چکا تھا۔ نمائے کو اپنی بھاگ دوڑ ضائع جانے پر کافی افسوس ہوا تھا۔ والد اپنے بیگ میں رہتی وہ واپس اندر آئی تھی۔ انکل بنوڑ کتابوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ وہ خود بھی ایک مرتبہ پھر کتابوں کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ لیڈر کا وہ قیمتی والد اپنے اندر نقدی بھی کافی زیادہ رکھتا تھا۔ کھول کر دیکھنے پر بغیر گئے ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ اس میں چھ سات ہزار روپے تو ضرور موجود ہیں۔ پیسوں کے ساتھ ہی کریڈٹ کارڈ بھی رکھا نظر آ رہا تھا۔ اس نے سرسری سا دیکھنے کے بعد والد ویسے ہی رکھ دیا تھا۔ تمام چیزیں نکال کر دیکھتا ہے غیر اخلاقی حرکت لگ رہی تھی۔

اگلے روز انکل اور نوہیے آئی کے جانے کے بعد وہ چوکیدار سے واک کرنے کا کہتی گھر سے باہر نکل آئی تھی۔ گیٹ پر تیل کرنے پر اسی روز والے ملازم سے سامنا ہوا تھا۔

”جی فرمائیے۔“ کے جواب میں اس کا اپنا سر پیٹ لینے کا دل چاہا۔ حد درجہ ایمانداری دکھانے کے چکر میں اس نے کریڈٹ کارڈ یا وزٹنگ کارڈ میں سے اس کا نام تک نہیں دیکھا تھا۔ ملازم اسے مشکوک نظروں سے دیکھ رہا تھا اسی لیے وہ فوراً ہاتھ میں پکڑا والد کھول کر اس میں سے وزٹنگ کارڈ ڈر اسایا ہر نکال کر نام دیکھتے ہوئے بولی۔

”مجھے اوزان واسف صاحب سے ملنا ہے۔“ اس کی حرکتیں پر ملازم سر سے لے کر پاؤں تک اسے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔

”آپ ذرا مہربانی فرما کر انہیں جلدی سے بلا دیں۔“ وہ اس کے گھورنے پر جھک کر بولی تھی۔ اسے باہر گھڑا چھوڑ کر گیٹ واپس بند کرنا وہ اندر چلا گیا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ دوبارہ آیا تھا۔

”صاحب آپ کو اندر بلا رہے ہیں۔“ اب کے لہجہ کافی منہ زب تھا۔

”مجھے اندر نہیں آنا۔ ان سے کوئی نہیں آکر اپنا یہ والٹ لے لیں۔“

وہ والٹ دکھاتے ہوئے ناراضی سے بولی تھی۔

”بڑے نواب صاحب ہیں۔ میں کس خوشی میں اندر جاؤں۔ خود وہ قدم چلنے کی زحمت نہیں کر سکتے۔“ وہ تپ مچتی تھی۔ ملازم نے سر سے اسے گھورتا واپس مڑ گیا تھا۔ اب کی بار اس پر اتنا بھروسہ کر لیا گیا تھا کہ گیٹ کھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔ ایک منٹ بعد ہی وہ کھلے گیٹ سے چلا اس طرف آتا نظر آیا۔

”آپ باہر کیوں کھڑی ہیں اندر آئیے ٹل۔“ بڑی خوشگوار فکسر اہٹ چہرے پر سجائے وہ اسے اندر آنے کی دعوت دے رہا تھا۔ لیو جینز اور بیوٹی ٹی شرٹ پہنے وہ خامسے ”گھریلو“ حلیے میں نظر آ رہا تھا۔

”شکریہ۔“ مجھے بس یہ آپ کا والد دینا تھا جو کل وہاں Book Fair میں آپ سے گر گیا تھا۔ میں اسی وقت آپ کے پیچھے تھی لیکن آپ تک میری آواز پہنچی نہیں تھی۔

وہ جلدی جلدی جملے مکمل کرتی والد اس کی طرف بڑھا چکی تھی۔ بجائے والد اس کے ہاتھ سے لینے کے وہ بے ساختہ بولا۔

”اس طرح گیٹ پر کھڑے کھڑے تو میں یہ ہرگز قبول نہیں کروں گا۔ آپ اندر آکر میرے ساتھ ایک کپ کافی کا پیئیں گی تو میں والد بھی اول گا اور آپ کا شکریہ بھی ادا کروں گا۔“ عجیب کھسکا ہوا بندہ ہے۔ دل ہی دل میں بیڑا ڈالی تھی۔

”آئیے پلایئر دوبارہ اصرار کیا گیا تھا۔ اسے اندر آنے کے لیے راستہ دینا وہ خستہ کھڑا تھا۔ اس کے اندر داخل ہونے پر وہ برا خوش نظر آ رہا تھا۔ وہ اسے لیے غالباً ”ڈرائنگ روم“ کی طرف آ رہا تھا تب ہی سامنے سے اس کا ”منظور نظر“ آتا نظر آیا تھا۔ وہ چلتے چلتے ٹھک کر رک گئی تھی۔ وہ اس کا ڈرائنگ روم پر خود بھی

کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

”یہ لہجہ آپ رکھنے کے لیے تیار ہی نہیں۔ اس لیے میں بس آپ کی یہی خاطر کر سکتا ہوں۔“ اس کے ہاتھ میں دو ”کٹ گیٹ“ پکڑنا ہوا وہ کسی قدر نامف سے بولا تھا۔

”تھینک یو“ کہہ کر اس نے دو لے لی تھیں۔

”آپ نے چیک کر لیا ہے میں اپنے پیسے وغیرہ۔“ وہ گیٹ کی طرف قدم بڑھاتی ہوئی کچھ سوچ کر بولی تھی۔

”میں نے اس کی ضرورت نہیں محسوس کی۔“ وہ لاپرواہی سے بولا تھا۔

”پھر بھی آپ کو دیکھ لینا چاہیے تھا۔“ وہ بند ہوئی۔

”وہ بہت محفوظ ہاتھوں میں تھا مجھے کسی چیکنگ کی کوئی ضرورت نہیں۔“ اس کے ساتھ ساتھ چلتا وہ اسی لاپرواہ انداز میں بولا تھا۔

”آپ نام کے علاوہ میرے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ پھر بھی یہ دعویٰ کر رہے ہیں۔“ گیٹ پر پہنچ کر وہ صاف گوانڈا میں بولی تھی۔

”میرا خیال ہے میں آپ کو بہت زیادہ جان گیا ہوں اسی لیے یہ بات کہہ رہا ہوں۔“ وہ اپنا لاپرواہ انداز ترک کر کے سنجیدگی سے بولا تھا۔ گیٹ سے باہر قدم نکالتی وہ ٹھٹک کر رک گئی تھی۔

”کسی کو جاننے یا سمجھنے میں ضروری نہیں ہے کہ کئی سال گئیں۔ بعض لوگ کھلی کتاب کی طرح ہوتے ہیں جیسے آپ۔ نمائے کو ایسا اس سے پہلے بھی کسی نے آپ کو یہ بات بتائی ہے کہ آپ کی آنکھیں کپ کے اندر کا ہر راز ظاہر کر دیتی ہیں۔ آپ کی ہر سوچ آپ کی آنکھوں کے ذریعے برہمی جاسکتی ہے۔ کم از کم میں تو آپ کی آنکھوں کی ہر حرکت دیکھ سکتا ہوں۔“

وہ بہت گہرے لہجے میں بولی رہا تھا۔ اس کا دل اچانک تیز تیز دھڑکنے شروع ہو گیا تھا۔ اپنے بارے میں اتنے مختلف جملے اور دعوے وہ بھی ایک بالکل انجان آدمی کے منہ سے وہ بری طرح گھبرا گئی تھی۔

اس نے شاید ہی انداز میں اسے دیکھا تھا۔

”یہ لہجہ آپ رکھنے کے لیے تیار ہی نہیں۔ اس لیے میں بس آپ کی یہی خاطر کر سکتا ہوں۔“ اس کے ہاتھ میں دو ”کٹ گیٹ“ پکڑنا ہوا وہ کسی قدر نامف سے بولا تھا۔

”تھینک یو“ کہہ کر اس نے دو لے لی تھیں۔

”آپ نے چیک کر لیا ہے میں اپنے پیسے وغیرہ۔“ وہ گیٹ کی طرف قدم بڑھاتی ہوئی کچھ سوچ کر بولی تھی۔

”میں نے اس کی ضرورت نہیں محسوس کی۔“ وہ لاپرواہی سے بولا تھا۔

”پھر بھی آپ کو دیکھ لینا چاہیے تھا۔“ وہ بند ہوئی۔

”وہ بہت محفوظ ہاتھوں میں تھا مجھے کسی چیکنگ کی کوئی ضرورت نہیں۔“ اس کے ساتھ ساتھ چلتا وہ اسی لاپرواہ انداز میں بولا تھا۔

”آپ نام کے علاوہ میرے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ پھر بھی یہ دعویٰ کر رہے ہیں۔“ گیٹ پر پہنچ کر وہ صاف گوانڈا میں بولی تھی۔

”میرا خیال ہے میں آپ کو بہت زیادہ جان گیا ہوں اسی لیے یہ بات کہہ رہا ہوں۔“ وہ اپنا لاپرواہ انداز ترک کر کے سنجیدگی سے بولا تھا۔ گیٹ سے باہر قدم نکالتی وہ ٹھٹک کر رک گئی تھی۔

”کسی کو جاننے یا سمجھنے میں ضروری نہیں ہے کہ کئی سال گئیں۔ بعض لوگ کھلی کتاب کی طرح ہوتے ہیں جیسے آپ۔ نمائے کو ایسا اس سے پہلے بھی کسی نے آپ کو یہ بات بتائی ہے کہ آپ کی آنکھیں کپ کے اندر کا ہر راز ظاہر کر دیتی ہیں۔ آپ کی ہر سوچ آپ کی آنکھوں کے ذریعے برہمی جاسکتی ہے۔ کم از کم میں تو آپ کی آنکھوں کی ہر حرکت دیکھ سکتا ہوں۔“

وہ بہت گہرے لہجے میں بولی رہا تھا۔ اس کا دل اچانک تیز تیز دھڑکنے شروع ہو گیا تھا۔ اپنے بارے میں اتنے مختلف جملے اور دعوے وہ بھی ایک بالکل انجان آدمی کے منہ سے وہ بری طرح گھبرا گئی تھی۔

اسے خدا حافظ کے بغیر وہ ایک دم چل پڑی تھی۔ اپنی نگلی میں مڑنے سے پہلے اس نے مرکز دیکھا تو وہ گیٹ پر کھڑا سے ہی دیکھ رہا تھا۔

رات بھر اسے "میں آپ کی آنکھوں کی ہر تحریر سمجھ سکتا ہوں" نے ڈسٹرب رکھا تھا۔ بعض لوگ نئے مختلف ہوتے ہیں، سب سے الگ۔ جیسے وہ اس کے لیے کی انفرادیت بات کرنے کا بے ساختہ انداز اسے سب سے الگ کر دیتے تھے۔ اپنی چھا جانے والی شخصیت اور منفرد طرز گفتگو کے ذریعے اسے لوگوں کو پہچاننا سیکھنا آتا تھا۔

انہی صبح نماز پڑھ کر وہ کچھ دیر لان میں بیواک کرتی رہی، پھر اس کے بعد روز پھر نکل گئی۔ اس روز کے بعد آج وہ دوسری مرتبہ صبح واک کرنے نکلی تھی۔ اسے واک کے لیے نکھنا بالکل بھی اچھا نہیں لگتا تھا پھر بھی وہ نکل آتی تھی اور اپنے یوں نکل آتے پر خود ہی حیران بھی ہو رہی تھی۔ وہ یوں خالی الذہنی کی کیفیت میں اپنی سڑک کے آخر تک پہنچ جاتی تھی۔ جو رنگ کرنا ہوا وہ گیٹ سے باہر نکھنا نظر آتا تھا۔ اسے نکلنے دیکھ کر وہ فوراً واپس سڑک تیز چلنے لگی تھی۔

"یا اللہ یہ مجھے کیا ہو رہا ہے، کیا میں کوئی فلمی قسم کی حرکتیں کرنے جا رہی ہوں۔" جو رنگ کرنا ہوا وہ اور دل اس بات کی غلی میں داخل ہو گئے تھے۔

"گڈ مارنگ" جو رنگ کرنا وہ اس تک پہنچ چکا تھا۔ دل اس طرف آنے کے بجائے روڈ کے دوسری طرف دوڑ رہا تھا۔ شاید وہ خود اس کے ڈوکے محسوس کر کے اس طرف نہیں آیا تھا۔ اسے خواہ مخواہ شرمندگی ہو رہی تھی۔

"آخر اتنے دنوں میں اس نے مجھے کبھی واک کرتے نہیں دیکھا کیا آج وہ حیران نہیں ہو رہا ہو گا۔" وہ جواہر "بشکل مسکراتے ہوئے گڈ مارنگ بول پائی تھی۔

"آپ کی ڈرائیونگ کا کیا حال ہے؟" وہ اس کے ساتھ ساتھ واک کرتے لگا تھا۔

"پریشکس چل رہی ہے۔" وہ سنجیدہ لہجے میں بولی

تھی۔ "آپ میرے ساتھ پریشکس کریں میں چند دنوں میں آپ کو ڈرائیونگ میں ماہر بنا دوں گا۔" وہ بڑی فرارخی سے اپنی خدمات پیش کر رہا تھا۔ پھر کچھ خیال آنے پر فوراً ہموال۔

"آپ چاہیں تو آج ہی آجائیں۔ بھٹے کے دن یوں بھی میری چھٹی ہوتی ہے۔ میں آپ کو پریشکس کروا دوں گا۔ ابھی جا کر مجھے شاور لینا ہے پھر باہر نکلتا کرنا ہے اور اخبار پڑھنا ہے۔ ایسا کریں آپ ساڑھے نو بجے تک آجائیں۔"

سارا پروگرام ترتیب دے کر وہ اس کی طرف اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے اس سارے پروگرام میں اسے کہیں کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔

"ٹھیک ہے پھر میں آپ کا انتظار کروں گا۔" اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ جو رنگ شروع کر چکا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ سڑک کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر ٹرن کر چکا تھا۔

اس پارے میں کچھ سوچنے کی گنجائش رہی نہیں تھی۔ ظاہر ہے اسے وہاں نہیں جانا تھا۔ اپنی صبح کی حرکت پر ہی وہ بری طرح چڑ رہی تھی۔ آخر یہ شخص میرے اعصاب پر کیوں سوار ہو رہا ہے۔ مان نہ مان میں تیرا مسمان۔ بلاوجہ بے تکلف ہونا۔ اتنا ڈرائیونگ سکھانے کا شوق ہے تو کوئی ڈرائیونگ اسکول جوائن کر لو اور وہاں جا کر اپنا شوق پورا کرو۔

تو یہ آئی اور انکل کے جانے کے بعد وہ بھی سب کچھ سوچتی بے دلی سے اخبار لیے بیٹھی تھی۔ گھڑی پر اس کی نظر گئی تو نو بج کر میں منٹ ہو رہے تھے۔ دوبارہ اخبار پر نظرس مرکوز کر دیں مگر کسی خبر میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ایک دم اخبار سائیڈ میں رکھ کر وہ گھڑی ہوئی اور وہ پٹہ ٹھیک کرتی گھر سے باہر نکل آئی۔

"کیا حرج ہے اگر میں چلی جاؤں وہ اتنا مذہب اور کھڑ ہے۔ کون سا میں اس سے عشق لڑا نے جا رہی ہوں۔" اس کے گھر کی جانب قدم اٹھائی وہ خود کو سمجھا

اس کے انداز پر بے ساختہ ہنس پڑا تھا۔ "چلیں مان لیا آپ نے نہیں دیکھا تھا۔" "چلیں مان میں نہیں میں نے بالکل نہیں دیکھا تھا۔ آپ کا نام تک میں نے آپ کے گیٹ پر کھڑے ہو کر جلدی جلدی نہ کیا تھا۔" وہ دوبارہ چڑنے انداز میں بولی تھی۔ "کیوں نہیں دیکھا تھا۔" اس نے فوراً سوال کیا تھا۔

"دوسروں کی چیزوں میں گھسنا جہالت اور بد تمیزی ہے۔" وہ جواہر "بولی تھی۔" "جھاڑی روکیں۔" اس کے کہنے پر نہانے نے بریک لگا دیا تھا۔

"جیسے اشارت برا تھا ویسے ہی گاڑی روکنا بھی بکواس تھا۔" جب سے والٹ نکال کر اس کی طرف پڑھاتے ہوئے وہ مایوسی سے بولا تھا۔

"مجھے "دوسروں" میں شامل کر کے آپ نے میرا بہت دل دکھایا ہے۔ اب آپ یہ والٹ لے کر پورا خالی کریں اور اس میں موجود ہر چیز دیکھنے کا آپ کو پورا پورا حق ہے۔" وہ روٹھے ہوئے لہجے میں بولا تھا۔

"دوسروں" میں اس قسم کی اجنبیت اور غیریت بالکل اچھی نہیں لگتی۔ وہ اس کی حیران شکل پر نظرس جمائے مزید گویا ہوا تھا۔

"دوستوں" نہانے نے دوستوں کو کافی لہسا کھینچا تھا۔ "میری آپ کے ساتھ دوستی کب ہوئی۔" وہ ہونق شکل بناتے بیٹھی تھی۔

"کب ہوئی کو رہنے دیں۔ یہ بتائیں کہ دوستی ہے تو ہاں۔" نہانے کو تسلیم کرنا پڑا کہ بات کو سمجھا پھر اگر کرنے میں یہ شخص حد درجہ مہارت رکھتا ہے۔ اب نہ دوستی سہی لیکن اسے دوست تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا چنانچہ وہ رولن لگا لی۔

"یہ ہوئی نا خوشی کی بات۔ اب اس خوشی میں آپ میرے ساتھ کافی بیٹیں گی۔" وہ خوش ہو کر بولا تھا۔ "آپ اپنا تعارف کروا رہے تھے۔" کلنی کی بات نظر انداز کر کے وہ فوراً "بولی تھی۔" "ہاں تعارف" وہ

اس کے انداز پر بے ساختہ ہنس پڑا تھا۔ "چلیں مان لیا آپ نے نہیں دیکھا تھا۔" "چلیں مان میں نہیں میں نے بالکل نہیں دیکھا تھا۔ آپ کا نام تک میں نے آپ کے گیٹ پر کھڑے ہو کر جلدی جلدی نہ کیا تھا۔" وہ دوبارہ چڑنے انداز میں بولی تھی۔ "کیوں نہیں دیکھا تھا۔" اس نے فوراً سوال کیا تھا۔

"دوسروں کی چیزوں میں گھسنا جہالت اور بد تمیزی ہے۔" وہ جواہر "بولی تھی۔" "جھاڑی روکیں۔" اس کے کہنے پر نہانے نے بریک لگا دیا تھا۔

"جیسے اشارت برا تھا ویسے ہی گاڑی روکنا بھی بکواس تھا۔" جب سے والٹ نکال کر اس کی طرف پڑھاتے ہوئے وہ مایوسی سے بولا تھا۔

"مجھے "دوسروں" میں شامل کر کے آپ نے میرا بہت دل دکھایا ہے۔ اب آپ یہ والٹ لے کر پورا خالی کریں اور اس میں موجود ہر چیز دیکھنے کا آپ کو پورا پورا حق ہے۔" وہ روٹھے ہوئے لہجے میں بولا تھا۔

"دوسروں" میں اس قسم کی اجنبیت اور غیریت بالکل اچھی نہیں لگتی۔ وہ اس کی حیران شکل پر نظرس جمائے مزید گویا ہوا تھا۔

"دوستوں" نہانے نے دوستوں کو کافی لہسا کھینچا تھا۔ "میری آپ کے ساتھ دوستی کب ہوئی۔" وہ ہونق شکل بناتے بیٹھی تھی۔

"کب ہوئی کو رہنے دیں۔ یہ بتائیں کہ دوستی ہے تو ہاں۔" نہانے کو تسلیم کرنا پڑا کہ بات کو سمجھا پھر اگر کرنے میں یہ شخص حد درجہ مہارت رکھتا ہے۔ اب نہ دوستی سہی لیکن اسے دوست تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا چنانچہ وہ رولن لگا لی۔

"یہ ہوئی نا خوشی کی بات۔ اب اس خوشی میں آپ میرے ساتھ کافی بیٹیں گی۔" وہ خوش ہو کر بولا تھا۔ "آپ اپنا تعارف کروا رہے تھے۔" کلنی کی بات نظر انداز کر کے وہ فوراً "بولی تھی۔" "ہاں تعارف" وہ

اسے اشارے سے گاڑی دوبارہ اشارت کرنے کے لیے کہتا ہوا اپنے بارے میں بتانے لگا۔

”ترکی کا رہنے والا ہوں۔“ استنبول میں میری پیدائش ہوئی۔ ڈیڑی کی جاب اس قسم کی تھی کہ مختلف ممالک میں ان کا ٹرانسفر ہوتا رہتا تھا اس وجہ سے تعلیم مختلف ممالک کے مختلف تعلیمی اداروں میں حاصل کی۔ سینئر کیمرنگ کے بعد میں امریکہ چلا گیا تھا وہاں سے اٹلانتا میں ماسٹری ڈگری لی پھر اس کے بعد ”یونیورسٹی آف ویس“ سے بزنس لیڈمنشپ میں ڈگری لی آج کل ایک ملٹی پھیل فرم میں مارکیٹنگ ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں۔ پچھلے ڈیڑھ سال سے پاکستان میں پوشند ہوں۔ بہن بھائی وغیرہ ہیں نہیں۔ پانچ سال ہوئے مئی ڈیڑی کا ایک کار ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا۔ فی الحال پیپلر لائف انجوائے کر رہا ہوں۔“

”اچھا تو آپ ترکی کے رہنے والے ہیں۔“

”جی۔ ویسے آپ نے کہاں کا سمجھا تھا۔“ وہ بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

”مجھے لگا تو ایسا ہی تھا مگر میں سو فیصد پر یقین نہیں تھی۔“

”میرے بدلے میں بھی ابھی آپ کو کافی محنت کی ضرورت ہے۔ بجائے سیکند کیئر کے آپ فور تھ کیئر لگا دیتی ہیں۔“ وہ اس کی خامی بتانے کے بعد کچھ خیال آنے پر دوبارہ بولا۔

”میں نے پچھلے ڈیڑھ سال میں آپ کو پہلے یہاں کبھی نہیں دیکھا۔ آپ کیا کہیں گئی ہوئی تھیں۔ یا ویسے ہی گھر سے باہر کم نکلتی ہیں۔“

”میں گراچی میں رہتی ہوں۔ یہاں تو اپنی آہنی انگل کے پاس پچھلیاں گزارنے آئی ہوں۔ بابا کو آفس کے کام سے کوریا اور جاپان جانا تھا میں نے سوچا اکیلے وہاں کیا کروں گی آہنی سے بیل نکالوں۔“ وہ اپنی توجہ سامنے مرکوز رکھتے ہوئے بولی تھی۔

”لو! تو اس کا مطلب ہے کہ کچھ دنوں میں آپ واپس چلی جائیں گی۔“ وہ کچھ مایوس سا نظر آنے لگا

”نہانہ نے ہاتھ مارا جیک اسے دیکھا تھا۔“

”اور آپ کے گھر میں کون کون ہے۔ آپ کیا کرلی ہیں کچھ اپنے بارے میں بتائیں۔“ وہ جلدی سے بات بدل گیا تھا۔

”میں نے بھی اٹلانتا میں ہی ماسٹری کیا ہے۔ آج کل کمپیوٹر پروگرامنگ کے کچھ کورسز کر رہی ہوں۔ گھر میں بس میں اور بابا ہیں۔ بڑی بہن کی شادی ہو چکی ہے۔“

”لئے ہاتھ پر ٹرن کریں اور ٹرن کرتے ہی اسینئرنگ فوراً سیدھا کر لیجیے گا۔“ اس کی بات کے جواب میں ہدایات جاری کرتا ہوا بغور اسے ٹرن کرتا دیکھ رہا تھا۔ گاڑی ریڈ پر ٹکل آئی تھی اسی لیے وہ ایک دم کونفیس ہو گئی تھی۔

”ابھی اچھی خاصی آپ نارمل طریقے سے گاڑی چلا رہی تھیں اب کیا ہو گیا۔ یہ چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں۔“ وہ اسے سرزنش کرتا ہوا بولا تھا۔

”مجھے ڈرائیونگ کرنے میں کوئی پر اہم نہیں ہوتی بس میرا دل چاہتا ہے کہ جہاں میں گاڑی چلاؤں وہ روڈ بالکل خالی ہو۔ دور دور تک، کوئی اور گاڑی بس، ریکش، ٹیکسی کچھ بھی نہ ہو۔“ وہ روائی میں اپنے دل کی بات بتا رہی تھی اور جواب میں وہ قطعہ لگا کر فز پڑا تھا۔ آدھا گھنٹہ ڈرائیونگ کرنے کے بعد وہ لوگ واپس گھر آ گئے تھے۔

”آجے کافی بھی پیئیں گے اور میں آپ کو اٹلانتا کی بہت اچھی اچھی کتابیں بھی دکھاؤں گا۔ آپ یقیناً انجوائے کریں گی۔“ گاڑی کا دروازہ کھولا ہوا وہ اس سے مخاطب ہوا تھا۔

”میں آج رہنے دیں۔ پھر کبھی آؤں گی۔“ انکار کرتے ہوئے وہ بھی گاڑی سے اترنے لگی تھی۔

”چلیں جیسی آپ کی مرضی۔ اچھا بیٹی تو رہیں۔“ وہ خود بھی گاڑی کا دروازہ دوبارہ بند کرنا ہوا پیٹھ گیا تھا۔

”اب کہاں جانا ہے۔“ وہ حیران ہوئی تھی۔

”آپ گاڑی اشارت ٹو کریں۔“ اس کے کہنے پر وہ دوبارہ گاڑی چلانے لگی تھی۔ اپنی گلی میں ٹرن ہوتے

”اپنی بیٹی کی کھلتی ہوئی آواز اور لبوں پر مسکراہٹ مجھے بتا رہی ہے کہ وہ خوش ہے۔“

”بابا آپ اتنی دور ہو کر بھی میرے دل کے سنے قریب ہیں۔ خوبات خود میں نے محسوس نہیں کی تھی آپ نے میلوں دور ہو کر محسوس کرلی۔ I Love you بابا! بابا میں خوش ہوں۔ کوئی چیز ہے جو میرے دل کو خوش کر رہی ہے۔ ایسا پہلے بھی نہیں ہوا۔ گھر میں بہت بہت خوش ہوں۔ زندگی بہت پیاری لگ رہی ہے۔ بابا میری اس خوشی کے قائم رہنے کی دعا کہجیے گا۔“ کہنے میں نظر اٹاتے اپنے عکس پر نظرس جمائے وہ دل ہی دل میں بابا سے مخاطب تھی۔

رات کو خواب میں اس نے بابا کو دیکھا تھا۔ ایک بڑی خوبصورت وادی تھی۔ ہر طرف پھول ہی پھول، قنبلے، ہیرالی اور سرسبز وشاداب درخت اونچے اونچے پہاڑ بھرنے، معطر ہوائیں۔ اس خوبصورت وادی میں وہ اور بابا سنگ سنگ چل رہے تھے۔ پھر اس منظر میں ایک اور شخص بھی شامل ہو گیا تھا۔ کتنا مکمل تھا وہ منظر۔ کہیں کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ بابا اور اوزان تینوں ساتھ ساتھ کھتے خوش لگ رہے تھے۔ اس کی آنکھ کھلی تو وہ جاگتی آنکھوں سے بھی نکلی دیر تک اسی منظر کو دیکھتی رہی۔

”کیا یہ سناج ہو سکتا ہے؟“ وہ لینے لینے سوچے جاری تھی۔

”اس کے دل میں میرے لیے کیا ہے میں نہیں جانتی۔ بلکہ میں تو خود اسے ہی زیادہ اچھی طرح نہیں جانتی۔ پھر ایسا کیوں ہو رہا ہے۔“

اپنی آنے والی زندگی سے متعلق ہر فیصلہ کرنے کا اختیار بابا کو سونپنے کے بعد وہ خود تو بہت مطمئن زندگی گزار رہی تھی۔ بابا نے خود اس سلسلے میں دشمن ما پہلے اس سے کافی مکمل کربات کی تھی۔ بار بار اس سے پوچھا تھا کہ اگر وہ کسی کو پسند کرتی ہے تو انہیں اس کی پسند پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ بابا تنگ نظریا دقیقانوسی خیالات کے مالک نہیں تھے۔ مگر اسے کبھی بھی کوئی اس لحاظ سے اچھا ہی نہیں لگا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ بابا

”اب یہ کیسے اور کیوں رہے دو تم خوشی کی وجہ سے۔“ وہ اپنے مخصوص پر شفقت انداز میں بولے تھے۔

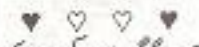
”آج تو بابا آپ کب واپس آئیں گے میں آپ کو مس کر رہی ہوں گا وظیفہ بھی نہیں پڑھا گیا۔ پتا تو چلے آخر خوشی کا پس منظر کیا ہے۔“ وہ بابا کی قیافہ دکھائی پر حیران تھی۔

”کوئی بھی خاص بات نہیں ہوئی بابا۔ شاید موسم کی نوکھاری نے میرے موز کو بھی خوشگوار بنا دیا ہے۔“

اپنی تیز بارش ہو رہی ہے۔ توبہ آہنی اور میں پکڑے رہنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ بس بہت مزہ آ رہا ہے۔ آپ کو بتا ہے میں بابا مجھے بارش کتنی اچھی لگتی ہے۔“

اس کے ساتھ کافی دیر بات کرنے کے بعد وہ بیورو رکھ کر وہ اپنے سے اتنی تو نظر ڈر سنگ نمیل کے شیشے پر

اس کے لیے جو بھی فیصلہ کریں گے وہ سب سے بہتر ہو گا۔ اس نے اپنے بارے میں ہر فیصلہ بابا پر چھوڑ دیا تھا۔ عمر اب زندگی میں وہ آیا تھا ایک دم اچانک وہ اس کے حواسوں پر چھا گیا تھا۔ جسے نہ وہ دھتک سے جانتی تھی اور نہ ہی اپنے بارے میں اس کی فہمکنگ اسے پتا تھیں۔ پھر بھی وہ اسے سوچ رہی تھی۔



صبح کے وقت جو گنگ اور انیکر سائز کرنا اس کی بہت پرانی عادت تھی اور اسی جو گنگ نے اسے اس بہت ہی پیاری لڑکی سے ملوایا تھا۔ اس انجینی شہر میں دل اس کا سب سے بہترین دوست تھا۔ دن کا باقی وقت تو دفتری مصروفیات اور بھانگی دوڑتی زندگی کا ساتھ دینے میں گزر جایا کرتا تھا۔ صبح کا وقت ہی خالصتاً اس کا اپنا وقت ہوتا تھا اور یہ وقت وہ اور دل ایک ساتھ گزارتے تھے۔ اس روز وہ جاگنگ کرنے نکلا تھا تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ آج کا دن زندگی میں کتنی بڑی تبدیلی لائے والا ہے۔

اگر وہ بے نیاز اپنی ہی کسی سوچ پر مسکراتی وہ لڑکی پتا نہیں کیوں اسے اپنی جانب متوجہ کر گئی تھی۔ وہ اس بل اپنی فہمکنگ کو بالکل نہیں سمجھ پایا تھا مگر وہ اس لیے کو کھوتا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اس لڑکی سے بات کرے۔ کیا بات تھی اس میں ایسی جو اسے متوجہ کر گئی تھی۔ کیا اس کی خوبصورتی؟ ہاں وہ خوبصورت تھی مگر وہ اس سچی چیزوں سے مرعوب ہونے والوں میں سے ہرگز نہ تھا۔ اس کی بے شمار لڑکیوں سے دوستیاں تھیں۔ اس کی کلاس فیلوز کو لیکر ان میں ایک سے بڑھ کر ایک حسین لڑکی بھی تھی مگر ان میں سے کوئی ایک بھی اسے اس لحاظ سے اچھی نہیں لگی تھی۔ شاید اس کی مسکراہٹ اوزان کو اپنی جانب متوجہ کر رہی تھی۔ بہر حال وہ اس لمحے کی گرفت میں آچکا تھا۔ وہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا مگر کس طرح؟ یوں سڑک پر بغیر جان پہچان کے کسی سے بات کیسے کی جاسکتی تھی اس نے اشارے سے ول کو اس طرف دوڑنے کے لیے کہا تھا۔ ول کا نیم خیمہ وجود اکثر

لڑکیوں کے ڈرنے کا سبب بن چکا تھا اور اس کے حسب توقع وہ ڈر کر چھٹنے لگی تھی۔ لڑکیوں سے بات کرنے کا موقع حاصل کرنے کے لیے کالج بوائز کی طرح کی حرکت پر خود کو سرفراز کرنے کے پانچو اس نے اپنی اس شرارت کو انجوائے بھی بہت کیا تھا۔ اسکول کے دنوں میں اپنے کلاس فیلوز کو ایسی حرکتیں کرتے دیکھ کر وہ ان کا مذاق اڑایا کرتا تھا اور آج اس میں چھوڑ کر عمر میں آکر خود ہی سب کر رہا تھا۔

دوسری مرتبہ وہ اسے اپنے ہی گھر کے باہر ملی تھی۔ وہ ان دونوں میں اسے بھولا نہیں تھا۔ دوبارہ اس کے مل جانے پر وہ بہت خوش ہوا تھا وہ بری طرح نروس لگ رہی تھی۔ اوزان کو وہ بہت معصوم اور سچی ہوئی لگ رہی تھی۔ اس روز جو گنگ کرتے ہوئے وہ جس کیفیت کو وقتی سمجھ رہا تھا وہ وقتی نہیں تھی۔ اس کا ڈرنا اوزان کو اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس روز اس کے چہرے پر اسے وہ مسکراہٹ بھی نظر نہیں آئی جس کی وجہ سے وہ اس کی جانب متوجہ ہوا تھا۔ پھر تو اوزان جاگنگ کرتے وقت دو چار سیکنڈ رک کر اس گھر کی طرف ضرور دیکھا کرتا تھا کہ شاید وہ نظر آجائے مگر وہ کبیں نظر ہی نہیں آ رہی تھی۔ پھر ایک روز جب وہ گروہ سرئی شاپ میں داخل ہو رہا تھا اسے وہ ٹیکری میں جاتی نظر آئی۔ اس کے ساتھ کوئی خاتون بھی تھیں۔ اپنی خریداری چھوڑ چھاڑو بھی ٹیکری میں داخل ہو گیا تھا اسے فائرز جان کر وہ دونوں آرام سے اردو میں بات چیت کر رہی تھیں جو کہ مکمل طور پر اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ اسلام آباد پوسٹنگ سے بھی پہلے اردو سے اس کی اچھی خاصی واقفیت تھی۔ اس کی ماں جس زبان کی مشہور شاعرہ اور افسانہ نگار تھیں کیا وہ اسے سرسری سا بھی پتا جانتا۔ مزید بہتری اسلام آباد قیام کے دوران آگئی تھی۔ نہ صرف یہ کہ وہ اردو سمجھ لیتا تھا بلکہ بول بھی لیتا تھا۔ اردو بولنی اس نے اپنی می سے ہی سیکھی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ وہ یہاں لوگوں کے ساتھ انکس میں بات کرتا تھا۔

اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اس لڑکی سے ڈھیر ساری

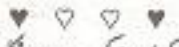
ماں کہہ اپنے بارے میں ہر بات اسے بتائے ہر بات وہ اس نے بھی کسی سے شہر نہیں کی اس کے ساتھ فینز کرے مگر کس طرح۔ ایسا کوئی حوالہ کوئی اطلاع درمیان میں نہیں تھا کہ اس کے ساتھ دوستی کر لی جائے۔ وہ حدود پر ریزو اور لیے دیے رہنے والی لڑکی محسوس ہوتی تھی۔ وہ اس پر اپنا کوئی غلط امپریشن نہیں لانا چاہتا تھا۔

اس نے اپنی می سے پاکستانی لڑکیوں کی شرم و حیا کے بہت قصے سنے تھے مگر یہاں اگر اسے اپنے ملک کے لڑکوں اور پاکستانی بچوں میں کچھ خاص فرق محسوس نہ ہوا تھا۔ ابھی اچھی فہمکنگ کی پڑھی لکھی لڑکیوں کو پارٹیز میں شرکت کرتے، مسکریٹے پتے اور ڈانس کرتے دیکھ کر اسے لگتا کہ وہ اسلام آباد میں تھیں شاید استنبول یا انقرہ میں ہی ہے۔ شاید ترکی کی طرح یہاں بھی ملازمن اسلام آچکا تھا۔ اسلامی روایات کی پاسداری کرنے والے جہاں Extremist اور

Fundamentalist کہلاتے ہیں۔ بے ہودگی اور بے شرمی کے ایسے ایسے مظاہرے کہ وہ مشرقی بچوں کے نام سے پتا نہ لگتے لگتا تھا۔ ایسے ماحول میں ایک ایسی لڑکی کا ملنا جس سے بات کرنے اور ملاقات کرنے کے لیے وہ مختلف ہمارے سوچ رہا تھا۔ اسے خود ہی حیران کر رہا تھا۔ بک فیس میں بھی ان دونوں کی ملاقات اتفاقاً ہو کر نہیں ہوئی تھی۔ وہ ایک بزنس میٹنگ میں آئے تھے وہاں جب ہوٹل سے نکلتے ہوئے اس نے اسے دیکھا تھا اور پھر اسے فالو کرتے کرتے وہ اسی اسٹال پر پہنچ گیا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ مزید ایک دو ایسے اتفاقات اور فالس آئے تو وہ مشکوک ہو جائے گی۔ اسی لیے اگلی ملاقات کا اہتمام اس نے اپنا والٹ وہل کر کر لیا تھا۔ اس کی توقع کے عین مطابق وہ والٹ واپس کرنے پہنچ گئی تھی۔

وہ بے چینی سے میرس پر کھڑا اس کے آنے کا اظہار کر رہا تھا۔ اس کے بہت اصرار پر اندر آجائے کہ وہ وہاں کچھ پریشان سی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اس سے کہے۔

”سنو نہا! تم زندگی میں کسی اور پر اعتبار کرو نہ کرو مگر مجھ پر تم آنکھیں بند کر کے بھروسہ کر سکتی ہو۔“ اس کے روکنے کے باوجود وہ رکی نہیں تھی مگر اوزان کے لیے یہی بہت تھا کہ وہ آگئی تھی۔ اگلا روز اس کے لیے بہت سی خوشیاں ملایا تھا۔ اس نے نہا سے کہا تھا کہ وہ اس کی آنکھوں کی ہر خیر پڑھ سکتا ہے اور یہ بات بالکل سچ تھی۔ ان بولتی آنکھوں کا ہر راز وہ فوراً پالیا کرتا تھا اور اس روز ان آنکھوں میں اس نے اپنے لیے بڑے خوبصورت رنگ دیکھے تھے وہ بات وہ وہ چھپا لیتا جانتی تھی مگر اس کی آنکھیں اسے بتا رہی تھیں۔ وہ آنکھیں اسے بڑے انوکھے اور الونٹی خواب دکھا رہی تھیں۔ کیا محبت ایسی ہی زور آور ہوتی ہے؟ کیا اسی طرح اچانک کوئی انجان شخص سب سے زیادہ اپنا لگنے لگتا ہے؟ وہ اب زندگی کا ہر بل اسی لڑکی کی شکست میں بتانا چاہتا تھا۔



وہ نماز پڑھ کر اپنے کمرے سے نکل کر بالکونی میں آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ ول کے ساتھ ساتھ دوڑتا اوزان دور سے ہی اسے دیکھ چکا تھا۔ نہا نے اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے ہاتھ پلایا تھا۔

”اے اچھے موسم میں گھر کے اندر کیا کر رہی ہیں۔ باہر آکر موسم انجوائے کریں۔“ وہ زور سے بولا تھا۔ پھر وہ رک کر اس کا انتظار کرنے لگا تو وہ گرجن ہلاتی ہوئی واپس اندر چلی گئی تھی۔ شال اوڑھ کر ٹوپہ آٹنی کو واک کا کھتی وہ گیٹ سے باہر آگئی تھی۔ سڑک کے کنارے کھڑا وہ خود کو وارم اپ کر رہا تھا۔

”میرے معصوم سے ول سے ڈر کر اب بالکل بھی اچھا نہیں کر تیں۔“ ول کی وجہ سے وہ کھڑا کھڑا اور بہت کر چل رہی تھی۔ اتنے خونخوار اور خطرناک کتے کے لیے ”معصوم“ کا لقب اسے خالصاً قابل اعتراض لگتا تھا۔

”آپ ایک بار بہت کر کے قریب آئیں یہ آپ کو کچھ بھی نہیں گے گا۔“ وہ اسے تسلی دینے والے

انداز میں سمجھا رہا تھا۔ اس کا دل کھٹے کی خاطر تھوڑا سا قریب آئی تو دل ایک دم بھونک کر اس کے قدموں سے لپٹا تھا۔ وہ ہلکی سی چیخ مار کر رو رہی تھی۔
 ”وہ آپ کو دیکھ کر رہا ہے۔ اپنے انداز سے آپ کو سمجھانا چاہ رہا ہے کہ مجھ سے ڈرو مت۔“ وہ شاید دل کی ”نفسیات“ میں P.H.D. کیے بیٹھا تھا۔

”آپ اس سے کہیں کہ یہ چوبلی سے نہ لپٹے“ وہ دوبارہ قریب آتے ہوئے ڈر کر بولی تھی۔ دل بھی اپنے مالک کے اشارے خوب سمجھتا تھا۔ اب کی بار اس کے قریب آنے پر وہ بے تکلف انداز میں خاموشی سے خراماں خراماں چلنا رہا تھا۔ ان دونوں کے درمیان شان بے نیازی سے چلتا وہ شاید خود کو برس آف ویلز سمجھ رہا تھا۔ نہاء کو اس کے گردن اکڑا کر چلنے پر ایک دم ہنسی آئی تھی۔

”بس اب آپ دل سے ڈرنا چھوڑ کر اس سے دوستی کریں۔“ اسے ہنستا دیکھ کر وہ بھی مسکراتا ہوا بولا تھا۔

”آپ دن بھر کیا کرتی رہتی ہیں؟“ کچھ دیر بعد بولا تھا۔
 ”کچھ بھی نہیں۔ صبح سے دوپہر تک اخبار پڑھتی ہوں اور کچھ بیڑے ساتھ وقت گزارتی ہوں۔ ڈھائی تین بجے تک آئی آجاتی ہیں۔ پھر پانی کا دن ٹوبہ آئی اور انکل کے ساتھ کہیں نہ کہیں گھومنے پھرنے میں گزار جاتا ہے۔“ وہ سیدھے سادے انداز میں اپنی روایت بتا رہی تھی۔

”مطلب یہ کہ دن میں آپ کبلی پور ہوتی ہیں۔“
 ”کسی حد تک یہ بات کئی جانتی ہے۔ ایسے اچھی خاصی یوریت ہوتی ہے۔“ وہ اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے بولی تھی۔

”ویسے آپ یہ بات کیوں پوچھ رہے تھے؟“
 ”بس یونی“ وہ اس کی بات کے جواب میں لاپرواہی سے بولا تھا۔

”میرا خیال ہے اب مجھے واپس چلنا چاہیے۔ میرا ہاتھ پر انتظار ہو رہا ہو گا۔“ وہ گھڑی پر نظریں دوڑاتے

ہوئے بولی تھی۔ وہ بھی اس کے ساتھ ہی واپس پلٹ گیا تھا۔
 ”کیا آپ آج لچ میرے ساتھ کر سکتی ہیں؟“ اس کی گلی میں داخل ہوتے ہوئے وہ آہستگی سے بولا تھا۔ نہاء نے ایک دم چونک کر اسے دیکھا۔ وہ بری اس بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”مجھے پتا ہے آپ اس بات کو اچھا نہیں سمجھتیں لیکن پلیز منع مت کہجیے گا۔ میں آپ سے بہت سی ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ جویوں سڑک پر نہیں کی جاسکتیں۔“ وہ ہر صورت اسے راضی کر لینا چاہتا تھا۔ اسے تذبذب میں مبتلا دیکھ کر وہ کچھ چپ سا ہو گیا تھا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ اسے کیا جواب دینا چاہیے لیکن اپنے گھر کے سامنے رکتے ہوئے وہ بے ساختہ بولی تھی۔ ”بس آؤں گی۔“ اور ان تین انگلیوں نے اسے کتنا خوش کروا تھا وہ اپنی خوشی چھپا نہیں پایا تھا۔

”تھینک یو۔“ وہ مسکراتا ہوا بولا تھا۔
 ”بس آپ کا انتظار کروں گا۔“ نہاء ایک دم آگے بڑھ گیا تھا۔ اس کا خوشی سے دھکا چوڑھن میں بسائے وہ اندر آئی تھی۔

”کیا بات ہے بڑی پابندی سے واک ہونے لگی ہے۔“ ٹوبہ آئی انڈے پھینکتے ہوئے مصروف انداز میں بولی تھیں۔

”میں اوزان کے ساتھ واک کرنے لگی تھی۔“ اسے ٹوبہ آئی سے جھوٹ بولنا اچھا نہیں لگا تھا۔

”اوزان وہی چندم سا فار نریند؟“ وہ ذہن پر زور ڈالتے ہوئے معنی خیز انداز میں مسکرائی تھیں۔

”جی ہاں“ وہ عام سے انداز میں کتنی یکن میل کے آگے رگھی کر سی تھیں کرینہ لگی تھی۔

”سب خیر تو ہے نا۔ معاملہ صرف دوستی تک ہے یا کوئی اور بات بھی ہے۔“ ٹوبہ آئی شرارت سے مسکرائی تھیں۔

”کیا ہو گیا ہے ٹوبہ آئی آپ کو۔“ وہ اچھا پڑھا لکھا بندہ ہے اس سے باتیں کر کے مزہ آتا ہے اور بس آپ

پوچھا تھا۔
 ”جی“ پیپی کا سپ لیتے ہوئے اس نے جواب دیا تھا۔

”بہت خوبصورت کپل ہے۔ ویسے آپ کی ممی کی شکل کچھ جانی پچانی سی لگ رہی ہے۔ شاید میں نے انہیں پہلے کہیں دیکھا ہے۔“ وہ ذہن پر زور ڈالتے ہوئے بولی تھی۔

”بالکل دیکھا ہو گا۔ اگر آپ کو اردو لٹریچر میں دلچسپی ہے تو آپ نے انہیں ضرور دیکھ رکھا ہو گا۔“ وہ حیران ہوئے بغیر بولا تھا۔

”اردو لٹریچر؟“ وہ ایک بل کے لیے متعجب ہوئی تھی۔ ”گلاس“ ٹیبل پر رکھتے ہوئے وہ اٹھ کر دیوار کے پاس چلی گئی تھی۔

”ولہ آئند“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا تھا۔ تصویر سے نظریں ہٹا کر وہ پلٹ کر سوالیہ نظروں سے اوزان کو دیکھنے لگی تھی۔

”بالکل صحیح پچانا آپ نے“ وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا۔ وہ اس کی ٹیورٹ افسانہ نگار کا بیٹا تھا۔ بات جان کر بھی وہ خوش نہیں ہو پائی تھی۔ زندگی کی تلخ چٹائیوں کو بے نقاب کرتے ولہ آئند کے افسانے اور دل کے آدوں کو چھوتی ہوئی مختصر نظمیں اسے بے حد پسند تھیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ خیال کہ وہ ایک ہندو عورت کا بیٹا ہے۔ اس کی ٹرکس لہستانی کے بارے میں جاننے کے باوجود اسے اسی بارے میں سب سے زیادہ خدشات تھے۔ وہ ابھی تک اندازہ نہیں لگا پائی تھی کہ وہ مسلمان ہے یا نہیں۔ براہ راست اس بارے میں اس سے کچھ پوچھنا اسے مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ وہ اس کے چہرے پر نظریں جمائے پتا نہیں کیا چیز بڑھ رہا تھا۔ وہ اپنی انجمن میں گرفتار اس کی نظریں محسوس نہیں کر پائی تھی۔ واپس صوفے پر آکر بیٹھتے ہوئے وہ کچھ چپ چاپ سی تھی۔ اپنے چہرے پر گڑی اس کی نگاہیں محسوس کر کے وہ کچھ ششامی گئی تھی۔

”بہت اچھے افسانے ہوتے تھے آپ کی ممی کے

”جی“ پیپی کا سپ لیتے ہوئے اس نے جواب دیا تھا۔
 ”بہت خوبصورت کپل ہے۔ ویسے آپ کی ممی کی شکل کچھ جانی پچانی سی لگ رہی ہے۔ شاید میں نے انہیں پہلے کہیں دیکھا ہے۔“ وہ ذہن پر زور ڈالتے ہوئے بولی تھی۔

”بالکل دیکھا ہو گا۔ اگر آپ کو اردو لٹریچر میں دلچسپی ہے تو آپ نے انہیں ضرور دیکھ رکھا ہو گا۔“ وہ حیران ہوئے بغیر بولا تھا۔

♥ ♥ ♥ ♥

اس کے تیل کرنے پر وہ خود گٹ کھولنے آیا تھا۔ اٹلا ٹوش بیسے اس کے گھر کسی بہت بڑی سلطنت کی علامت کے قدم رنجی فرماتے ہوں۔ اسے کچھ جھجک سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کبھی لڑکوں سے بے تکلف نہیں بولی تھی۔ اپنے کزنز تک سے اس کی صرف اس کے بیٹے بولی تھی۔ اس کے چہرے پر بڑا بڑا لکھا ”لوٹ“ کسی کو بھی اس سے بے تکلف ہونے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ کسی موٹی طرف سے انویٹیشن دیا جانا اور اسے قبول بھی کر لینا اس کے لیے بڑا انوکھا اور غیر معمولی تجربہ تھا۔

”مجھے آپ کا لان بہت اچھا لگتا ہے۔“ وہ اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے لان پر نظریں دوڑاتی ہوئی بولی تھی۔ ”اس بات کا اندازہ مجھے پچھلی بار ہی ہو گیا تھا۔ آپ بھی میری طرح نیچر لوگ لگتی ہیں۔“ مرکزی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے ہوئے وہ ایک نظر اس پر ڈال کر بولا تھا۔

لاؤنج میں اسے بٹھا کر وہ خود کہیں چلا گیا تھا۔ ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے وہ لاؤنج کا جائزہ لے رہی تھی۔ ایک دھنٹ میں بیٹھ گیا تھا۔ پیچھے پیچھے لازم کولڈ ڈرنکس لیے اندر آیا تھا۔

”یہ آپ کے ممی ڈیڈی کی تصویر ہے۔“ سامنے دیوار پر لگی تصویر کو بغور دیکھتے ہوئے نہاء نے

میرے پاس ان کے سارے افسانوی مجموعے ہیں۔“
اپنے تاثرات اس سے چھپالینے کی سعی کرتے ہوئے
وہ زبردستی مسکرائی تھی۔

”شکریہ“ وہ گہری نگاہیں اس پر ڈالتے ہوئے بولا
تھا۔ ملازم نے آکر کھانا لگ جانے کی اطلاع دی تو وہ
اسے ساتھ لیے ڈائننگ روم میں آگیا تھا۔ اس کا اب
یہاں رکنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اچانک بہت سارا
رونے کی خواہش دل میں چل رہی تھی۔ اس کے
سامنے والی کرسی سنبھالنے کے بعد وہ پلیٹ اس کے
آگے کرتا ہوا مختلف ڈشز پیش کر رہا تھا۔

”آپ کی پسند ناپسند کا تو مجھے پتا نہیں تھا۔ جو جو
چیزیں مجھے پسند ہیں وہ سب بنوائیں کہ آج آپ میری
پسند کا کھانا کھائیں۔“ ٹیبل پر موجود مختلف اٹالین
ڈشز دیکھ کر اس کا دل بھر آیا تھا۔ کیا وہ مختلف جگہوں
کے رہنے والے لوگوں کی پسند ناپسند یکساں ہو سکتی
ہے؟ اٹالین کھانے اس کے من پسند تھے۔ وہ جب
بھی باہر کھانا کھانے جاتے نہاء کی چوائس اٹالین ڈشز
ہوتی تھیں۔ اٹالین ڈشز کے ساتھ ساتھ بریانی کی
موجودگی کی وجہ وہ ہنستے ہوئے بتا رہا تھا۔

پاکستانی کھانوں میں میں مجھے سندھی بریانی بہت
پسند ہے۔ میری ممی سکھر کی رہنے والی تھیں۔ سندھی
اسپیکنگ اور یہ بریانی وہ بہت مزے کی بناتی تھیں۔
مجھے اور ڈیڈی کو ان کے ہاتھوں کی بنی یہ بریانی بہت
پسند تھی۔“ وہ اس کے تاثرات سے بے نیاز بڑے
آرام سے کھانا کھا رہا تھا۔

”نہاء سے مت پوچھیں کیا پکنا ہے یہ محترمہ بریانی
کے علاوہ کسی اور چیز کا نام لے سکتی ہیں۔“ مہرو کی آواز
کہیں پاس ہی سنائی دی تھی۔ اس کی آنکھوں میں
مرچیں سی لگنے لگی تھی۔ سر جھکائے خاموشی سے
ایک ایک نوالہ لیتی وہ خود کو کمپوز کرنے کی کوشش
کر رہی تھی۔

وہ اسے اصرار کر کر کے مختلف ڈشز لینے کے لیے
کہہ رہا تھا۔ کھانے کے بعد واپس لاؤنج میں آتے
ہوئے وہ آہستگی سے بولی تھی۔

”سراخیل کے سب مجھے چلنا چاہیے۔“
”آپ جلدی ابھی تو میں آپ کو اپنے ہاتھوں کی پی
گرین لی پلو اوں گا۔“ وہ اسے بیٹھنے کے لیے کہتا ہوا
بھی بیٹھ گیا تھا۔ چپ چاپ سر جھکائے بیٹھے بیٹھے
اچانک اسے احساس ہوا کہ اوزان بالکل خاموش بیٹھا
ہے۔ وہ اتنا چپ کیوں ہے؟ نہاء نے سر اٹھا کر اس کی
طرف دیکھا تو وہ گہری نظروں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔
اس کے دیکھنے پر بھی اس نے اپنی نظریں نہیں ہٹائی
تھیں۔ نہاء کو اس کی آنکھوں سے خوف آرہا تھا۔
اپنی کوئی بھی سوچ اس پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔
گڑبڑا کر اس نے اپنا سر دوبارہ جھکا لیا تھا۔

”بھی کتنا عرصہ اور آپ پاکستان میں رہیں گے؟“
وہ خود کو سرزنش کرتے ہوئے نارمل انداز میں بولی
تھی۔

”نہاء تم مجھ سے وہ بات پوچھو جو پوچھنا چاہتی
ہو۔“ گہرے گمبیر لہجے میں یہ جملہ وہ اردو میں بولا تھا۔
عام حالات میں وہ شاید اس کے اردو بولنے پر حیران
ہوتی مگر اس وقت اس کی بات اسے حیران ہونے کا
موقع نہیں دے پائی تھی۔ وہ بری طرح نروس ہو گئی
تھی۔ اضطرابی انداز میں ہاتھ مسلتی وہ کنفیوز سی
بیٹھی تھی۔ وہ اس شخص سے اپنی کوئی سوچ نہیں پھاسا
سکتی۔ اس نے خود سے اعتراف کیا تھا۔

”میں شراب نہیں پیتا جھوٹ نہیں بولتا“ اپنے
عہد کی پاسداری کرتا ہوں“ لوگوں کے ساتھ لین دین
میں ایمانداری سے کام لیتا ہوں۔ کسی کو دھوکا نہیں
دیتا۔ اگر میری ان تمام اچھائیوں کے باوجود بھی تم
مطمئن نہیں تو تمہاری تسلی کے لیے میں بتا دوں کہ
ہاں میں مسلمان ہوں۔“ وہ اس کی شرمندہ شرمندہ سی
شکل پر نظریں جمائے بول رہا تھا۔ نہاء پلکیں جھپکائے
بنا اس غیر معمولی ذہن آدمی کو دیکھے جارہی تھی۔

”میرے ڈیڈی ایک لبرل قسم کے مسلمان گھرانے
کے فرد تھے۔ ایک ایسا گھرانہ جہاں سب کے نام
مسلمانوں والے ہوتے ہیں۔ کسی بھی جگہ مذہب کے
خانے میں اپنا مذہب اسلام رکھنے کی حد تک مسلمان۔

اس کے علاوہ اسلام کا ان لوگوں کی زندگیوں سے دور دور تک کوئی واسطہ نہیں تھا اور ڈیڈی تو اچھے خاصے Atheist تھے۔ پڑھنے کے لیے کمپیوٹر یونیورسٹی گئے تو وہاں ان کی ملاقات ولما آئندہ سے ہوئی۔ جو ایک کٹر ہندو گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ تعلیم وغیرہ کی آزادی دینے کے باوجود ان کے خاندان میں لڑکیوں کی شادی اپنے ہم مذہبوں میں بھی ذات پات دیکھ کر کی جاتی تھیں۔ ایک کٹر روٹہ گھرانے سے تعلق رکھنے کے باوجود خود ان کا مذہب کی طرف زیادہ رجحان نہیں تھا۔ کلاس فیلو ہونے کے ناطے ابتدا میں دوستی اور پھر بعد میں ایک دوسرے سے محبت نے انہیں شادی کے رشتے میں پابند دیا تھا۔ ڈیڈی کے گھر والوں کو تو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہ تھا مگر می کے گھر والوں نے شادی کے بعد ان سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ ڈیڈی باہم کے مسلمان اور می باہم کی ہندو۔ ان دونوں کے درمیان یہ انگریز صنف تھا کہ مذہب کے معاملے پر بھی آپس میں نہیں الجھیں گے۔ ان دونوں کے لیے کسی بھی مذہب کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش تھے۔

میں نے اپنے می ڈیڈی میں مثالی محبت دیکھی۔ مذہب کے معاملے میں می ڈیڈی نے مجھے عمل آزادی دی تھی۔ نہ ڈیڈی نے بھی مجھ پر کوئی دباؤ ڈالا نہ می نے۔ سچی بات تو یہ تھی کہ اپنے گھر کے اس ماحول کو دیکھتے ہوئے میں مذہب کو زیادہ اہم سمجھتا ہی نہیں تھا۔ نہ میں نے ڈیڈی کو کبھی نماز پڑھتے دیکھا نہ می کو بوجایا کرتے۔ می بھی کبھار اپنے گھر والوں کو یاد کر کے لو اس ہو جایا کرتی تھیں۔ ان کے بہت دفعہ کونٹریکٹ کرنے کے باوجود وہاں کوئی بھی ان کی صورت دیکھنے تک کارواہ نہ تھا۔

تعلیم مکمل کر کے میں امریکہ سے واپس آئیں تو می مجھے بہت بدلی ہوئی محسوس ہوئیں وہ بہت سوشل تھیں، کوئی حوالے سے بھی ان کا وسیع حلقہ احباب تھا۔ مگر اب اچانک وہ گوشہ نشین ہو گئی تھیں۔ لوگ انہیں مختلف فنکشنز میں الوائٹ

کرتے اور مدد دیتے کرتے تھے۔ می کے دوستوں کی تہذیبی میرے لیے عجیب خیز تھی۔ میں نے می کو ایک مرتبہ رات کے وقت اکیلے میس پر بے چین چمکا دیکھا میرے بہت پوچھنے پر بھی وہ مجھے کچھ نہیں بتا تھیں۔ ان کے مزاج کی یہ تبدیلی ڈیڈی کے لیے بھی بہت پریشانی کا باعث بن رہی تھی۔ وہ می کی یہ کیلیڈ میرے آنے سے بھی پہلے سے برداشت کر رہے تھے۔ می ان دنوں کافی وقت پوچا کرتے اور گیتا پڑھتے ہوئے گزارنے لگی تھیں۔ میرے ماں باپ خدا کے وہاں کے ہی مگر تھے اور اب یہ تہذیبی؟ میں نے ڈیڈی سے اس بارے میں بات کی تو وہ کچھ افسردگی سے بولے۔ ”وہاں کو اس عمر میں اگر مجھ سے شادی کے فیصلے بچتا ہوا ہونے لگا ہے۔ ہم میں کوئی اختلاف کوئی لڑائی نہیں لیکن وہ پھر بھی خوش نہیں۔ اسے اپنے ماں باپ اپنا وطن، اپنے لوگ، اپنے ہوا و بار یاد آتے گئے ہیں۔ لیکن اب وہ سب اسے واپس نہیں مل سکتا یہ زندگی خود اس کی پسند کردہ تھی اور اب وہ زندگی کو اس سے دیکھنے لگی ہے کہ اس نے زندگی میں جو فیصلے کیے سب غلط تھے۔“

ڈیڈی کا دکھ میں سمجھ سکتا تھا وہ می سے بہت پیار کرتے تھے۔ مگر اس مسئلے کا میرے پاس کوئی حل نہیں تھا۔ خود میرے لیے مذہب بڑی ثانوی سی چیز تھی۔ جس روز می ڈیڈی کا ایکسیڈنٹ کا شکار ہوئے اس صبح میری می سے بڑی تفصیلی بات ہوئی تھی۔ وہ برسوں بعد مجھے اٹھانے میرے کمرے میں آئی تھیں۔ میرے پاس بیٹھ کر میرے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے بالکل پہلے کی طرح۔ مجھے ان کا ایسا کرنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔

”شکر ہے می آپ کو یاد تو آ گیا کہ اس گھر میں آپ کا ایک جد و اکلوتا بیٹا بھی موجود ہے۔“ میں نے اپنا سر ان کی گود میں رکھتے ہوئے لاڈ سے شکوہ کیا تھا۔ وہ میری بات پر ہلکا سا مسکرائی تھیں۔

”می بس آپ پہلے کی طرح ایکٹو ہو جائیں۔ مجھے اپنی رائٹر اور شاعری سے عشق ہے۔ جن کے فیروز

ایسا لگ رہا تھا کہ کب کب کے دکھ آنسوؤں کے ساتھ بہ رہے تھے۔“

”اوزان میری جان میں نے زندگی میں بہت غلطیاں کیں۔ تم ایسا مت کرنا۔ مذہب کے بغیر انسان کچھ نہیں۔ آج میری کوئی پہچان نہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے میرا وجود زمین اور آسمان کے بیچ کہیں معلق ہے۔ مجھے اپنے پیروں کے نیچے زمین محسوس نہیں ہوتی۔“

مجھے میرے ماں باپ، بہن بھائی یاد آتے ہیں۔ اپنے گھر کے رسم و رواج اور چھوٹی چھوٹی باتیں میں انہیں جیسے بھول سکتی ہوں۔ وہ سب میرے ضمیر میں ہے۔ ان سے بھاگ کر بھی میں بھاگ تو نہیں پائی۔ کاش میں نے اپنی پسند سے ہی شادی کی ہوتی مگر کسی ہم مذہب سے۔ تب زندگی کتنی پامعنی ہوتی۔ میرا اپنا ایک وجود ہوتا۔ میری اپنی پہچان ہوتی۔ ہم نے اپنے ساتھ ساتھ تمہارے ساتھ بھی زیادتی کی۔ اوزان تم ہم لوگوں کی طرح کھوکھلی زندگی مت گزارنا۔ تم خدا کو نہیں مانو گے تو وہ خود اپنا آپ تم سے تسلیم کر والے گا۔ مگر بچپن میں ان کے ساتھ ہی کیوں۔ ابھی سے کیوں نہیں۔“

میرے سے پہلے ہی میری می سے آخری طویل بات ہوئی تھی۔ اس رات وہ اور ڈیڈی کسی دوست کی عیادت کے لیے جارہے تھے کہ راتے میں ان کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ می تو موقع پر ہی دم توڑ گئی تھیں۔ ڈیڈی شدید زخمی ہو گئے تھے۔ حوالے کی اطلاع پاتے ہی میں بدحواس ہو کر اسپتال بھاگا تھا۔ وہ شاید میرے انتظار میں آخری سانسیں لے رہے تھے۔

”اوزان تم کسی مسلمان لڑکی سے شادی کرنا۔“ ٹوٹ ٹوٹ کر کھینچاں ان کے منہ سے یہ الفاظ نکلے تھے۔ میرے ماں باپ ختم ہو گئے تھے۔ اپنے اپنے دلوں میں بہت سے بچپن کے لیے۔ می نے اپنے بچپن میں ان کا اظہار کر دیا تھا جبکہ ڈیڈی خاموش رہے تھے۔ میں نے ماں کی چٹا چٹائی تھی اور باپ کو دفن کیا تھا اور اس روز پہلی مرتبہ میں نے مذہب کی اہمیت تسلیم کی تھی۔ ہاں نہا یہ سچ ہے کہ مذہب کے بغیر انسان

میں جہاں میری جان۔“ وہ میری

میں اب وہ سب اسے واپس نہیں مل سکتا یہ زندگی خود اس کی پسند کردہ تھی اور اب وہ زندگی کو اس سے دیکھنے لگی ہے کہ اس نے زندگی میں جو فیصلے کیے سب غلط تھے۔“

میں نے اسی طرح رو پڑی تھی۔ میں نے اسی سے بیٹھا

میں نے اسی طرح رو پڑی تھی۔ میں نے اسی سے بیٹھا

صبح یا دوپہر کی فلائٹ سے کراچی پہنچ جاؤں۔ مگر بھی اتنے دنوں سے بند رہا ہے۔ صفائی و عیوب کرنی ہوگی پھر پایا کے لیے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھاؤں گی۔ اب مجھے اتنی ایک نشہ منٹ ہو رہی ہے۔ کتنے دنوں بعد میں پایا سے ملوں گی۔ وہ اس کا خوشی سے جھلکاتا چہرہ دیکھ کر خاموش ہو گیا تھا۔

”کیا ہوا آپ چپ کیوں ہو گئے؟“ اسے اچانک دھیان آیا تھا۔

”کیا تمہارے جانے کا سن کر مجھے شواہد بجانے چاہیے تھے؟ اور تمہاری بے وفائی تو مجھے ابھی سے صاف نظر آ رہی ہے۔ اتنا خوش تو میں نے تمہیں اتنے دنوں میں کبھی نہیں دیکھا۔“ وہ ناراضی سے بولا تھا۔

”کیا مجھے اپنے پایا سے ملنے پر خوش نہیں ہونا چاہیے؟“ وہ حیران ہوئی تھی۔

”نہیں، پایا سے ملنے پر تمہیں بہت خوش ہونا چاہیے لیکن جو شخص پایا سے ذرا کم سہی لیکن تمہیں بہت اچھا لگتا ہے اس سے دور جانے پر ہلکا سا بھی افسوس نہیں۔“ وہ دھمکے لہجے میں شکوہ کر رہا تھا۔ اس کی بات سن کر وہ بے اختیار مسکرا دی تھی۔

”مجھے تو کوئی افسوس نہیں ہو رہا لیکن پلیس آپ کا دل رکھنے کے لیے میں افسرہ شکل بنانے کے لیے تیار ہوں۔“ وہ اسے چارہ دی تھی۔

”سنو میں تمہارے پایا سے ملنا چاہتا ہوں۔ ان کے آتے ہی فوراً“ وہ بدستور سنجیدہ تھا۔ اس کی سنجیدگی دیکھ کر نساء کو بھی سنجیدہ ہو جانا تھا۔

”آپ پایا سے ملیں گے۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی تھی۔

”ہاں اور اب احمقوں کی طرح یہ مت پوچھنا کہ کیوں؟“ وہ چکر کرواتا تھا۔

”کیوں؟“ وہ خود کو بولنے سے روک نہیں پاتی تھی۔

”تمہارا“ اس نے دانت پیسے تھے۔

”میں بھی ہم سرک پر نہ ہوتے تو میں تمہیں اس کیوں کا اچھی طرح جواب دیتا۔“ وہ جمل کرواتا تھا۔

میرا وہ سر ہلکا رہا۔ ”وہ کل کر مسکرایا تھا۔“

”ہاں“ وہ بڑے مطمئن انداز میں بولی تھی۔

”گور تم نے اپنے بارے میں مجھ سے نہیں پوچھا کہ تم مجھے سب سے زیادہ اچھی لگتی ہو یا نہیں؟“ وہ

شوخ سی مسکراہٹ چہرے پر لیے پوچھ رہا تھا۔

”آپ خود ہی بتا دیں۔“ وہ فون پر بڑی بے ادبی باتیں کر رہی تھی۔ شاید اس کے منہ پر وہ یہ باتیں کبھی بھی نہ کہہ پاتی۔

”میں نے کتابوں اور کہانیوں میں محبت کا بہت ذکر سنا تھا۔ مگر وہ حقیقت یہ کہی ہوئی ہے یہ مجھے تم سے مل کر پتا چلا۔ تم سے مل کر میں نے جانا کہ محبت وہ ہوتی ہے جب آپ کو کوئی اپنے ہی وجود کا حصہ لگنے لگے۔

جب کوئی اور اپنے ہی وجود میں دھرتا اور سانس لیتا محسوس ہو۔ جب یہ لگے کہ زندگی بس اسی کی وجہ سے ہے۔ زندگی کے تمام رنگ اسی کی مرہون منت ہیں

جب دوسرے کی خوشیاں اور غم سب اپنے لگنے لگیں اور تم نے نساء مجھے محبت کے معنوں سے آشنا کروایا ہے۔“

”پتا چل رہا ہے کہ میرا مخاطب ایک بہت بڑی شاعرہ کا بیٹا ہے۔“ اس نے بات انہی میں اڑائی تھی مگر اندر ہی اندر ان لفظوں کی سچائی اور گہرائی اسے اپنی گرفت میں لے چکی تھی۔

خدا ایا اس محبت کو میرا نصیب کر دے۔ اس بہت بارے انسان کو میری زندگی میں شامل کر دے۔ اس رات اس نے بہت شدت سے اپنے رب سے دعا کی تھی۔ صبح وہ واک کے لیے نکل ہی رہی تھی کہ پایا کا فون آیا۔ وہ اسے اپنی واپسی کی اطلاع دے رہے تھے۔ پایا سے بات کر کے وہ خوشی خوشی باہر نکل گئی تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ بھی آتا نظر آیا تھا۔ آج اسے دل سے بھی ڈر نہیں لگا تھا۔ اس کے ساتھ چلتے ہوئے اس نے پایا کی واپسی کا بتایا تو وہ ایک دم چونک گیا۔

”یعنی تم جانے والی ہو۔“

”ہاں۔ بس کل کا دن اور میں یہاں ہوں۔ پرسوں شام کے وقت پایا پہنچیں گے۔ میں کوشش کروں گی کہ

تلفظ۔“ وہ خود کو اس کی تعریف کرنے سے نہیں روک پاتی تھی۔

”اچھا تو خیر نہیں ہوں۔ تمہیں لگ رہا ہوں تو دوسری بات ہے۔“ وہ سنجیدگی چھوڑ چھاؤں کیم

شرارت پر آمادہ نظر آیا تھا۔ وہ اس کی بات پر ایک دم جھینپ گئی تھی۔

”میں تمہیں اچھا لگتا ہوں ناں؟“ وہ اسی شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ سوالیہ انداز میں بولا تھا۔

”بہت دیر ہو گئی۔“ یہی آہنی آہنی ہوں گی۔“ وہ ایک دم بوکھلا کر اٹھ گئی تھی۔ اس کے انداز پر وہ مسکرا رہا تھا۔

”بے شک۔“ وہ مسکراہٹ لہوں پر روکتا ہوا بولا تھا۔ اپنا شہبانا اور نروس ہونا اسے بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا مگر وہ خود کو اس بل کیوز نہیں

کر رہی تھی۔ اسے خود ہی شاید اس کی حالت پر رحم آیا تھا اس لیے مزید اصرار نہیں کیا تھا۔ وہ اسے گرت پر خدا حافظ کہنے آیا تھا۔ اسے گاڑی اشارت کرنا دیکھ کر وہ افسردگی سے بولا تھا۔

”جس روز تم گاڑی کو اشارت صحیح طرح کرو گی۔ میری طرف سے ٹیٹ ہوگی۔ مگر لگتا ہے اس ٹیٹ کا موقع بھی کب تک نہیں۔“ ہنستے ہوئے اس نے گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔

♥ ♥ ♥ ♥

رات کو وہ اپنے کمرے میں بید پر نیم دراز لی وی دیکھ رہا تھا جب فون کی تیلی بجی تھی۔ ریسیور اٹھاتے ہی نساء کی آواز کانوں سے گرائی تھی۔

”لو زبان آپ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔“ وہ اس کی بات پر مسکرایا تھا۔

”سب سے اچھا نہیں؟“ سوالیہ انداز میں پوچھا گیا تھا۔

”نہیں سب سے اچھے تو مجھے پایا لگتے ہیں۔ ان جتنا اچھا تو کوئی اور لگ ہی نہیں سکتا۔“ وہ صاف کوئی سے بولی تھی۔

”پلو پایا سے کم ہی سہی۔ یعنی اچھا لگنے والوں میں“

کچھ نہیں چاہے وہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو۔ مجھے ہاں نہ بے اختیار کرنا چاہیے یا آپ کا۔ تب میں فیصلہ نہیں کر رہا تھا۔ میری معلومات دو دنوں مذہب کے بارے میں ناقص تھیں۔ میں جتنا سوچ رہا تھا اتنا ہی اچھا رہا تھا۔ مجھے کسی بھی میڈیٹی نے اپنے اپنے مذہب کے حوالے سے کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔

پھر ایک روز میں نے خدا سے دعا کی کہ میں آپ کے دوا کا مسٹر نہیں۔ مگر صبح اور غلام کا فیصلہ نہیں کر پا رہا۔ وہ مذہب کچھ ہے آپ اس طرف میرا دل پھیر دیجئے۔ مجھے یاد ہے اس روز سونے سے پہلے تک ستر پر لیٹا میں اپنے خدا سے ہم کلام رہا تھا۔ میں نے اس سے رہنمائی مانگی تھی اور اس نے میری رہنمائی کی تھی۔ صبح جب میں بیدار ہوا تو فیصلہ ہو چکا تھا۔ جب

جتنو ہو تو راستہ خود خود آسان ہو جاتا ہے۔ جو باتیں میرے دل باب نہیں سکھایا تھے میں آہستہ آہستہ سیکھتا چلا گیا۔ اپنے مذہب سے متعلق تمام ضروری باتیں۔ فرائض خود میں سب سے آگاہ ہوتا گیا۔

اس بات کو پانچ سال گزر گئے ہیں۔ ابھی بھی میں یہ دعویٰ تو نہیں کرنا کہ بہت اچھا مسلمان ہوں۔ ہاں میں نماز پڑھتا ہوں۔ ڈرنک نہیں کرتا۔ جھوٹ نہیں بولتا۔ خود کو گناہوں سے بچانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس سب میں کبھی بھول چوک بھی ہو جاتی ہے مگر وہ پھر بھی مجھے معاف کر دیتا ہے۔ کبھی مجھے راستے سے ہٹنے نہیں دیتا۔“

وہ ایک گہری سانس لے کر چپ ہو گیا تھا۔ نساء ایک ٹک اسے دیکھے جارہی تھی۔

”تمہیں اسی بات کی پریشانی تھی ناں نساء؟“ وہ نہ اس سے جھوٹ بول سکتی تھی اور نہ ہی بولنا چاہتی تھی۔ بے ساختہ انداز میں اس نے گردن ہلا دی تھی۔

”میں نے تم سے اپنے بارے میں کچھ نہیں پوچھا یا۔“ یہی ہوں میں۔ اچھا یا برا اپنا ماضی اور حال سب میں نے تمہیں بتا دیا۔“

وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا بول رہا تھا۔

”آپ بہت اچھے ہیں لو زبان، دوسروں سے بالکل

”میرے بابا بہت روشن خیال اور لہلہ ہیں۔ لیکن پھر بھی آپ کا ڈائریکٹ ان سے ملنا ٹھیک نہیں۔ میں نے زندگی بھر بابا سے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی۔ ابھی بھی نہیں چھپاؤں گی۔ پہلے میں ان سے بات کر لوں۔ پھر آپ کو انفارم کر دوں گی۔“ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی تھی۔

”کتنے برے وقت پر تم نے واپسی کا پروگرام بنایا ہے۔ آج آفس میں اپنی امپورٹنٹ میٹنگ ہے کہ چھٹی بھی نہیں کر سکتا۔ اچھا دیکھو کل تمہیں جانے کا پروگرام مت رکھنا۔ کل ہم بہت سارا وقت ساتھ گزاریں گے۔ پھر پتا نہیں کتنے دنوں بعد ملنا ہو۔“ وہ بہت اداس لگ رہا تھا۔ واپس گھر آئی تو اسے محسوس ہوا کہ جس اداسی نے اسے اپنی لپٹ میں لیا تھا وہی اسے بھی اپنی لپٹ میں لینے لگی ہے رات میں اس کا فون آیا تھا۔

”تم کل صبح نو بجے تک آسکتی ہو؟“ سلام دعا کے بعد وہ فوراً بولا تھا۔

”ٹھیک ہے آجاؤں گی۔“ وہ فوراً ”ہاں“ گئی تھی۔ ٹوپے آنٹی کے علم میں لائے بغیر اس سے ملنے چاہنا نساء کو اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ واک کرنے والی بات انہیں پتا بھی نہ تھی کہ وہ اس کے گھر بھی چلی جاتی ہے انہیں یقیناً ”معلوم نہیں تھا۔ مگر بہت بے تکلفی کے باوجود وہ اس بارے میں انہیں کچھ بتا نہیں پاردی تھی۔ ہر بار ایک جھجک آؤے آجاتی تھی۔

”جب میں ٹوپے آنٹی کو نہیں بتا پاردی تو بابا سے کیسے بات کر دوں گی۔“ بابا سے بہت زیادہ دوستی کے باوجود یہ بات کرنا اسے بہت مشکل لگ رہا تھا۔ ابھی سے وہ اس وقت کے لیے خود کو تیار کر رہی تھی۔ جانے سے پہلے آج وہ اس سے آخری مرتبہ ملنے جارہی تھی۔ اسی لیے اس کا خوب اچھی طرح تیار ہونے کا دل چاہ رہا تھا۔

اپنا بیگ اور ریڈ چنری کا سوٹ پہن کر ہلکی چھلکی چو لری اور میک اپ کے بعد اس نے اپنے کمر تک آتے سلی بائل کو کھلا چھوڑ دیا تھا۔ نو بجنے سے تھوڑی

دیر پہلے اس کا فون آیا تھا۔ ”تم نکلتا مت۔ میں تمہیں گھر پر لینے آ رہا ہوں۔“ ٹھیک نو بجے وہ اسے لینے پہنچ چکا تھا۔ اسے تو صوفی نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے گاڑی اشارت کر دی تھی۔ اسے گھر کے بجائے کہیں اور جانا دیکھ کر وہ حیرانی سے بولی تھی۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ ”ایک جگہ ہے میری بہت پسندیدہ۔ بس کچھ ہم وہاں جا سکیں گے۔“ وہ مطمئن انداز میں بولا تھا۔ وہ ایک دم کچھ بے چین سی ہو گئی تھی۔ اوڑان ایک نظر اس پر ڈال کر وہ بارود سکرین پر نظر سجا کر بولا۔ ”تمہیں کچھ پریشان ہے؟“ وہ اس کی فیس ریڈنگ پر اب حیران نہیں ہوتی تھی۔ اسی لیے بجائے حیران ہونے کے جواب میں ”ہاں“ بولی تھی۔

”اعتبار تو ہے۔ لیکن“ وہ اس کی بات کاٹ کر ڈپٹے والے انداز میں بولا۔ ”جب اشارے سے تو پھر لیکن کا کوئی سوال نہیں۔ تمہیں کچھ پریشان رکھنا چاہیے۔ دو ڈھائی گھنٹے میں ہم واپس بھی آجائیں گے۔ دیکھو ان خوبصورت لمحات کو اس فضول بحث میں برباد مت کرو۔“ وہ ٹوکے والے انداز میں بولا تھا۔

”میں چاہتا ہوں کہ تمہارے جانے کے بعد میرے پاس تمہارے حوالے سے بہت سی یادیں اور باتیں ہوں۔“ وہ بڑی سنجیدگی سے بولا تھا۔ خاموشی سے ڈرائیو کرتا نہ وہ مزید کچھ بولا تھا اور نہ ہی نساء۔ دونوں خاموش رہ کر شاید ایک دو سرے کے ہونے کو پوری شدتوں سے محسوس کرتا چاہتے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹہ کی ڈرائیو کے بعد اس نے گاڑی سڑک کے کنارے روکی تھی۔ اسے اترنے کا کہتے ہوئے وہ کچھلی طرف کا دروازہ کھول کر کچھ نکالے گا تھا۔ وہ بھی اس کے پاس آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بڑے سے سائز کی پکنک باسکٹ دیکھ کر وہ مسکرا دی تھی۔

”اچھا تو ہم لوگ یہاں پکنک منانے آئے ہیں۔“

”اچھا تو ہوں؟“ اس نے تصدیق چاہی تھی۔

”ذرا ایک نظر مگر دیکھ لو ہم کتنا اوپر آچکے ہیں۔“ ”میری رائے کیوں مانگ رہے ہیں۔ آپ کا جوبل چاہ رہا ہے وہ کریں۔“ وہ اس پر سکون انداز میں بولی تھی۔ اس نے ایک دم اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ وہ جو بڑے مطمئن انداز میں چلتی اسے مسلسل چڑا رہی تھی بے اختیار چپٹی تھی۔ اس نے فوراً ہی اس کا ہاتھ دوبارہ تھام لیا تھا۔ اس کی ناراض شکل دیکھ کر وہ ہنس رہا تھا جبکہ وہ شدید غصے کے عالم میں سر ہٹائے چل رہی تھی۔ اوپر پہنچتے ہی اس نے فوراً اپنا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

”ابھی اور کتنا چلنا ہے؟“ وہ ناراضی سے پوچھ رہی تھی۔ ”بس یہ پانچ دس منٹ کے فاصلے پر۔ جگہ تو یہ بھی بری نہیں مگر وہ جگہ یہاں سے بھی زیادہ اچھی ہے۔“ وہ اطمینان والے انداز میں بولا تھا۔

اچانک ہی وہ اپنا غصہ بھول بھال کر اس جگہ کی خوبصورتی میں کھو گئی تھی۔ صنوبر اور دیودار کے درختوں میں گھری وہ جگہ کتنی حسین تھی۔ وہاں کتنا سکون تھا۔ وہاں دور دور تک سوائے سبزے کے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

”میں اکثر ویک اینڈز مری“ ایبٹ آباد“ تنہا چلی یا بھورن میں گزارتا ہوں۔ ایسے ہی ایک بار اتفاقاً“ یہ جگہ مجھ سے یوں دریافت ہو گئی کہ میری گاڑی یہاں خراب ہو گئی تھی۔ تم نے محسوس کیا نساء! کہ یہاں قدرتی حسن کے ساتھ ساتھ کتنا سکون بھی ہے۔ کوئی شور شرابا نہیں۔ جب بھی مجھے سکون کی تلاش ہوتی ہے میں یہاں آجاتا ہوں۔ وہ سبز و گل میں گھرے اس جنت نظیر گوشے کی طرف اشارہ کرتا ہوا کہ رہا تھا۔ جنگلی پھولوں کی بھینی بھینی مسکاحول کو پر کیف بنارہی تھی۔

نرم مچھلیں گھاس پر ننگے پاؤں ملنے کی خواہش پیدا ہوتی تو وہ جھک کر سینڈ لٹا مارنے لگی تھی۔ باسکٹ ایک طرف رکھتا ہوا وہ پھولوں کی مختلف زاویہ سے

”سوچ کیوں رہے ہیں چھوڑ دیں۔“ وہ مطمئن انداز میں بولی تھی۔

”اچھا تو ہوں؟“ اس نے تصدیق چاہی تھی۔

تصاویر لینے لگا تھا۔
 ”چلو ایک تصویر تمہاری بھی اس پھولے منہ کے ساتھ لو۔“
 ”جی نہیں شکریہ۔ مجھے تصویریں کھینچوانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔“ وہ منہ بنا کر بولی تھی۔ مگر وہ پھر بھی تصویر کھینچ چکا تھا۔ دوسری تصویر لینے لگا تو اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔
 ”اب تم یہ فلم ایکسپوز دلے خڑے مت دکھاؤ۔“ وہ اس کے منہ دوسری طرف کر لینے پر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔
 ”ویسے میں نے صرف ہاتھ چھوڑا تھا۔ گرتے تو نہیں دیا تھا۔“
 ”چھوڑا تو تھا۔“ وہ غصے سے بولی تھی۔
 ”ہاں چھوڑا تو تھا چلو بھی میری غلطی ہے۔ میں ایکسکیوز کر رہا ہوں۔“ وہ بڑے آرام سے ہتھیار ڈال گیا تھا۔
 ”لب تم وہاں اور رخت کے پاس جا کر کھڑی ہو بہت خوبصورت تصویر آئے گی۔“ آپ تصویریں کھینچنے کے بعد یہ Floppy مجھے دیے دیں گے۔“ وہ رخت کے پاس جاتے ہوئے بولی تھی۔
 ”نہیں“ بڑا صاف انکار تھا۔ ”کیوں؟ آپ تو آتے رہتے ہیں اور کھینچ لے جیسے گاہے مجھے دے دیں۔“
 ”میں اس کی ایک کاپی تمہیں بھیج دوں گا۔“ وہ اطمینان دلاتے ہوئے بولا تھا۔ وہ باسکٹ میں سینڈویچز، کیک، فروٹس، کولڈ ڈرنکس، بروسٹ، چاکلیٹس وغیرہ بھر کر لایا تھا۔ ساتھ ساتھ بچہ کرکھاتے پیتے اور دھیر ساری تصویریں کھینچتے وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلا تھا۔ ایک دوسرے سے چھوٹی چھوٹی بے شمار باتیں کی گئی تھیں۔ وہ اسے اپنے گھر اور بابا کی باتیں بتاتی رہی تھی اور اوزان اسے اپنے بچپن کے مختلف واقعات سناتا رہا تھا۔ اس لوگوں اور نجوم سے دور خوبصورت اور پرفضا جگہ پر مثالی ٹی بی چٹک ان دونوں ہی کے لیے یادگار تھی۔ واپس آتے وقت بھی وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اتری تھی۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے وہ اس

سے بولا۔
 ”مسنو ہم یہاں جلد ہی دوبارہ آئیں گے۔“
 ”انشاء اللہ“ اس نے دل ہی دل میں کہا تھا۔
 ”ہم لوگ ہر ویک اینڈ یہاں پر ہی گزارا کریں گے۔“ ڈرائیو کرتے ہوئے وہ مستقبل کے حسین خواب بن رہا تھا۔ وہ اس کے ہر خواب کے سچا ہونے کی دعا کر رہی تھی کہ یہ خواب ان دونوں کے تھے۔ اس کے گھر کے سامنے گاڑی روکتے ہوئے وہ سنجیدگی سے بولا۔
 ”کل صبح تم چلی جاؤ گی اور میں کل ہی سے تمہارا انتظار شروع کروں گا۔“ پھر اس نے ایک پل کے لیے اس کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھے تھے اور فوراً ہی ہٹا بھی لیے تھے۔
 ”خدا حافظ“ وہ اندر داخل ہو جانے کے بعد بھی اسے مڑ کر دیکھتی رہی تھی۔
 ♥ ♥ ♥ ♥
 ”بابا! میں نے آپ کو کتنا مس کیا ہے آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔“ ڈانٹنگ ٹیبل پر بابا کے ساتھ بیٹھی وہ اپنی بے بسیوں کی داستان سنارہی تھی۔ شام سے اب تک وہ بیک جملہ کئی مرتبہ بول چکی تھی۔
 ”لگ تو نہیں رہا کہ مجھے مس کیا تھا مس نہا طار ق نے یہ کھلا کھلا فریض چھو تو یہ بتا رہا ہے کہ خوب سیو تفریح کی گئی ہے اور بے چارے غریب بابا شاید ایک آدھ مرتبہ اتفاقاً یاد آگئے ہوں گے۔“ وہ اسے چھیڑتے ہوئے کہہ رہے تھے۔
 ”بابا! ناراضی سے کہتی رہو مجھ گئی تھی۔“
 ”آپ میری محبت پر شک کر رہے ہیں۔“
 ”جی ہاں مجھے میری تو یہ۔“ وہ ہنستے ہوئے بولے تھے۔
 ”لیکن پھر بھی کوئی بات تو ہے میری بیٹی کی آنکھوں کی چمک بتا رہی ہے کہ اسے کوئی بہت بڑی خوشی ملی ہے۔“ وہ پیار بھری نگاہیں اس کے چہرے پر نکالتے بولے تھے۔ وہ ایک دم سنجائی گئی۔ بابا سے کچھ چھپا یا جھوٹ بولنا کتنا مشکل کام تھا۔ وہ بے ساختہ سر جھکا کر اپنی پلٹ میں چاؤل ڈالنے لگی تھی۔

”ایسا کیا لائے ہیں۔ میں نے جوہو“
 ”سب لائیں ہیں نا۔“ وہ جلدی سے
 ”براہ راست ان کی آنکھوں میں“
 ”مگر روری تھی۔“
 ”مگر لایا ہوں۔ کھانے کے بعد آرام سے“
 ”موٹی پیس الگ کرنا۔ کوئی آنا جانا“
 ”وہ کوئی تاثر چہرے پر لائے بغیر“
 ”ایسا لائیں بولے تھے۔“
 ”پہلے اس نے اپنی ای میل“
 ”اس کی میل موجود تھی۔“
 ”میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“ صرف ایک مختصر
 ”اب اپنی اور اس کی پھولوں کے درمیان کھینچی گئی“
 ”اس نے ساتھ ہی سمجھی تھی۔ وہ مونیٹر پر“
 ”نئی دیر تک اس تصویر کو دیکھتی رہی“
 ”اپنی پھا جانے والی شخصیت کے ساتھ چہرے پر“
 ”وہ اس کے برابر میں کھڑا کتنا خوش لگ“
 ”رہا تھا۔ وہ رات بھر خود کو بابا سے بات کرنے کے لیے“
 ”اپنی رانی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ بابا کو شاید اس“
 ”کے بارے میں پتہ تو تھا بہت اعتراض ہو گا۔ وہ یہ“
 ”کہ اس کے کہ اس کا رہن سہن اور طرز زندگی ان کے“
 ”ہاتھ ملاقات نہیں رکھتا ہو گا۔ مگر جب وہ اس سے“
 ”میں کے توان کے تمام خدشات دور ہو جائیں گے۔“
 ”اس کا من اور ذہن تو کسی بھی شخص کو کھوں“
 ”اس کے ساتھ ہے اور وہ سو فیصد ان کے معیار پر پورا“
 ”آئے گا۔ کتنی ساری عادتیں تو اس میں ہو سکیں گی اسی“
 ”بابا! ابتدا میں میں اس کی طرف متوجہ بھی اسی“
 ”دور سے ہوتی تھی کہ وہ بابا کی طرح ہے۔ انہیں کی“
 ”طرح اصولوں کا پابند نہ تھا اور صاف کو ذہین مڈر اور“
 ”ایک اندازہ اور بابا ہی کی طرح مجھ سے بہت پیار کرنے“
 ”والا۔“
 ”اب آپ کے بعد وہی ایک ایسا شخص ہے جس“
 ”کی محبت مجھے کوئی شبہ نہیں۔ آپ کے بعد اگر کوئی“
 ”میں نے اس کی محبت کرنا ہے ایسی محبت جو بغیر“
 ”کلمہ کے کی جاتی ہے تو وہ وہی ہے۔ میں نے اس کی“

آنکھوں میں آپ کی طرح سچائی اور خلوص دیکھا ہے۔“
 ”وہ بابا کے قصور سے مخاطب ہوئی تھی۔“
 ”صبح وہ بابا کے ساتھ ہی واک کرنے پارک آگئی تھی۔“
 ”آج میں بھی آپ کے ساتھ واک کروں گی۔“
 ”ان کی حیرت کے جواب میں اطمینان سے بولی تھی۔“
 ”اسے ایسا لگا تھا کہ وہ یہ بات بابا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بھی نہیں کہہ سکتی۔ ساتھ ساتھ ٹھٹھٹے ہوئے شاید وہ یہ بات کر جائے۔ اسے اپنے کسی عمل یا بات پر کوئی شرمندگی نہیں تھی مگر پھر بھی وہ جھجک رہی تھی۔ بابا سے ایسی بات کرنے میں ابک شرمناک تھی۔“
 ”مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“
 ”گھاس پر نظر سے جھانکے وہ آہستگی سے بولی تھی۔“
 ”ہو تو“ وہ بڑے آرام سے حیران ہوئے بغیر بولے تھے۔ اپنی اس لاڈلی بیٹی کی آنکھوں کا کوئی تاثر ایسا نہیں تھا جو وہ بڑھ چلا پاتے ہوں۔ وہ کل سے ہی اندازہ لگائے بیٹھے تھے کہ وہ ان سے کچھ کہنا چاہ رہی ہے۔ ایسی بات جو کہ کتنا بھی چاہ رہی ہے اور چھپکا بھی رہی ہے۔ وہ اسے آرام سے بات کرنے کا موقع دینے کی خاطر اس پر نظر ڈالے بغیر اوجھر دیکھتے ہوئے چل رہے تھے۔
 ”بابا! میں نے آپ سے کبھی جھوٹ نہیں بولا کبھی کوئی بات نہیں چھپائی اس لیے کہ آپ سے بڑھ کر میرا کوئی اور راز دار ہے ہی نہیں۔ آپ نے مجھ سے چند مہینے پہلے پوچھا تھا کہ مجھے کوئی پسند تو نہیں اور میں نے کہا کہ نہیں۔ مگر اب ایسا نہیں ہے بابا۔“
 ”وہ بہت آہستہ آواز میں بول رہی تھی۔ وہ اب بھی حیران نہیں ہوئے تھے انہیں بات کی نوعیت کا اندازہ پہلے ہی تھا۔ وہ توقع کر رہی تھی کہ اس کے چپ ہونے پر وہ کچھ کہیں گے یا کچھ پوچھیں گے مگر وہ اس کی طرف دیکھے بغیر خاموشی سے چلتے رہے تھے۔“
 ”بابا! آپ مجھ سے کچھ پوچھیں گے نہیں؟“ وہ کچھ گھبرا کر ان کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

وہ سارا دن الجھتی رہی تھی۔ خود کو آنے والے وقت کے لیے تیار کرنے لگی تھی۔ اسے یقین تھا بابا اس بارے میں بات ضرور کریں گے۔ وہ ان کے ہر خدشہ کا جواب تلاش کرتی رہی تھی۔ آفس سے آکر بھی انہوں نے اس سے اس بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔ بس یہ تھا کہ روزانہ کے برخلاف وہ اس کے ساتھ بیسی مذاق نہیں کر رہے تھے۔ بہت خاموش خاموش تھے۔ ہوں جیسے مسلسل ٹوکی بات سوچ رہے ہوں۔

روزانہ رات میں سونے سے پہلے وہ اس پر دم کرنے آتے تھے اس کا ہاتھ چوم کر شہ بخیر کرنا اور لائٹ ہٹ کر کے ٹائٹ بلب جلانا ان کا برسوں کا معمول تھا۔ آج بھی وہ اس کے کمرے میں آئے تھے۔ وہ ٹکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس پر دم کرنے کے بعد جانے کے بجائے وہ سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گئے تھے اس نے بے اختیار چونک کر ان کی طرف دیکھا تھا۔

وہ آخری بات بولتے ہوئے تھوڑا سا پتکچا پائی تھی۔
سر جھکائے ہوئے وہ لین کی طرف سے کسی قسم کے
سوال جواب کی منتظر تھی۔ وہ اس کے بارے میں مزید
کچھ پوچھیں گے اسے خدشات ظاہر کریں گے یا فتنے
کی لابی بھرس گے۔ محمد کو کچھ بھی نہیں پوچھ لے تھے۔ وہ
ان کی خاموشی سے الجھ رہی تھی۔

انداز میں ہوتی تھی۔
 ”بیا آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔“ وہ گھبرا کر بولی
 تھی۔
 ”سنا میری بات کا جواب دو۔“ وہ اس کی بات
 نظر انداز کر کے سر دلوے میں پڑے تھے۔
 ”جو فیصلہ آپ کریں گے وہ۔“ وہ لٹن کے لہجے سے
 ڈر کر فوراً بولی تھی۔

ہم اپنی زندگی کا فیصلہ خود کرنا ستر کھنچ کر ہوتا
ہو کر اسے اس میں نہیں۔ لیکن اگر فیصلے کا اختیار مجھے
ہو تو میری طرف سے انکار ہے۔ میں مجھیں
میں بھی مجبور نہیں کروں گا اگر بات میری
ہو تو ایک ایسا شخص جس کا ہمارے فخر
اور زبان سے دور دور تک کوئی واسطہ نہیں
ہو سکتا۔ شادی کوئی بچوں
میں۔ اے کسی کا اچھا لگ جانا دوسری بات
اور ساری زندگی ساتھ بھانا دوسری بات جس
کوئی کار خیز ہے نہ مایہ پاپ میں اس کے
میں بھی نہیں کر سکتا۔ یہ باتیں کتابوں
میں لکھی ہیں مگر حقیقت سے ان کا دور دور
نہیں۔ ابھی اسے اسلام اچھا لگے گا
کچھ عرصے بعد وہ تجرباتی طور پر ہندو
یا کرسچن یا پھر اپنے مایہ پاپ کی طرح
اور قومیت انسان کے بنیادی حوالے

تم نے کوئی پاکستانی اور صحیح معنوں میں مسلمان نہ
 دیکھا ہو گا تو مجھے کوئی اعتراض نہ تھا۔ مگر جانتے
 تھے اپنی بیٹی کو کسی تجربے کی بھینٹ چڑھانے کے
 لیے میں تیار نہیں۔ اگر تمہیں یہ لگ رہا ہو کہ میرا
 دل بہت طالعانہ اور یک طرفہ ہے تو تمہیں مجھ سے
 انکاف کرنے کی پوری پوری آزادی ہے۔ میں
 تمہیں روکوں گا نہیں۔ ابھی تم جس عمر سے گزر رہی
 ہو تمہیں یہ باتیں بہت بری لگ رہی ہوں گی۔ مگر
 ادا کا لی بی ہے۔ شادی دو خاندانوں کا میل ہو
 گا۔ اس میں صرف محبت کافی نہیں ہوتی اور مجھ
 کی باتیں دیکھتی پڑتی ہیں۔ کچھ سے نہیں تیسرے
 سے بہت۔ تم میری اپنی باتوں کو دہراؤ گی تو میرے
 کہے کا کہہ پا گی ہر بات صحیح ہے۔ میں اپنی بیٹی
 کو غلط نہ دیکھنا چاہتا ہوں اور مجھے نہیں لگتا کہ
 میں اس کے لیے کوئی غلطی کر رہا ہوں۔"

اس کی آنکھوں میں دیکھنے سے گریز کر رہے تھے۔ ان سے ہم بہت پیار کرتے ہوں ان کی آنکھوں

میں آنسو دیکھنا دنیا کا سب سے مشکل کام ہوتا ہے وہ اپنی بات مکمل کر کے رکے نہیں تھے۔ بغیر اس کی طرف دیکھے۔ تیزی سے باہر نکل گئے تھے وہ دل پر ہاتھ رکھے ساکت بیٹھی تھی۔ آنسو ایک لواتر سے بہتے چلے جا رہے تھے۔

میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" کی آوازیں
سماعتوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ وہ رات کتنی طویل
تھی۔ ایسا لگتا تھا اس شب کی سحر بھی نہیں ہوگی۔

اس وقت تو یوں لگتا ہے اب کچھ بھی نہیں ہے
مہتاب نہ سورج نہ اندھیرا نہ سویرا
آنکھوں کے دریچوں پہ کسی حسن کی چلن
اور دل کی پناہوں میں کسی درد کا ڈیرا
ممکن ہے کوئی وہم تھا ممکن ہے سنا ہو
گلیوں میں کسی چاپ کا اک آخری پھیرا
شاخوں میں خیالوں کے کھٹنے پیڑ کی شاید
اب آکے کرے گا نہ کوئی خواب بھیرا
فجرنی اذان سن کر وہ ایک دم بستر سے اٹھ بیٹھا
تھی

”خمنیں میں یوں بکھر گئی تو بابا کا کیا ہو گا۔ وہ کیا سوچیں گے کہ شہداء کی جھ سے محبت اتنی کمزور اور ہلکی تھی کہ ذرا سی آزمائش بھی نہ سہہ پائی۔“

مانا کہ یہ سنسان گھڑی سخت کڑی ہے
لیکن مرے دل یہ تو فقط ایک گھڑی ہے
وہ اپنے اشک خشک کرتی خود کو سمجھ رہی تھی۔

صبح بابا کا سامنا کرنا اسے دنیا کا سب سے مشکل کام لگ رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ بابا اس سے کتنی شدید محبت کرتے ہیں اس کی روٹی ہوئی آنکھیں انہیں ڈسٹرب کر رہی تھیں۔

نارمل انداز میں بولی تھی۔

”گنڈ مارنگ پیٹا“ وہ ایک گہری نظر اس پر ڈال کر رہ بیٹھ گئے تھے۔

”تو آج آپ تھوڑا جلدی آسکتے ہیں۔“ چائے
کپان کے آگے رکھتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔

ان کی سوالیہ نظریں دیکھتے ہوئے خودی کہنے لگی۔ ”کل سے میرا انسٹی ٹیوٹ کھل جائے گا تو میں بڑی ہو جاؤں گی۔ کچن کا کچھ سامان لینا ہے۔“

”ٹھیک ہے آجاؤں گا۔“ وہ اخبار پر نظریں دوڑاتے ہوئے بولے تھے جب تک بابا گھر پر رہے تھے وہ خود کو نارمل پوز کرتی رہی تھی۔ ان کے آفس جاتے ہی وہ پھر سے بے ہمت ہو کر رو پڑی تھی۔ خود کو سنبھالنا اور نئے سرے سے جوڑنا اس کے لیے بہت مشکل کام تھا۔ مگر یہ مشکل کام اسے اپنے بابا کے لیے کرنا تھا۔ وہ انہیں کوئی بھی دکھ نہیں دینا چاہتی تھی۔

”بابا جو آپ کا فیصلہ ہے وہی میرا بھی ہے۔ کیا آپ کو دکھ دے کر میں خوش رہ سکتی ہوں۔ آپ کو دکھ پہنچانے کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتی۔“

وہ بابا کی اور اپنی تصویر ہاتھوں میں لیے بیٹھی تھی۔ اس کی سالگرہ کے دن کی تصویر۔ بابا اسے اپنے ہاتھوں سے کیک کھلا رہے تھے۔

”یا اللہ مجھے ہمت دے میں بابا کا مان کبھی نہ توڑوں۔ کبھی ان کا دل نہ دکھاؤں۔ جو کچھ بابا چاہتے ہیں میں وہ کروں۔“ وہ کھٹنوں میں سر دیئے روئے چلی جا رہی تھی۔ اگر بات ایک دوسرے کو سمجھانے اور قائل کرنے کی ہوتی تو وہ بابا سے بہت کچھ کہہ سکتی تھی مگر بابا نے ایسی کوئی گنجائش چھوڑی ہی نہیں تھی۔ انہوں نے زندگی میں پہلی بار اپنا باپ ہونے کا حق استعمال کیا تھا اور کیا وہ اتنی خود غرض بن جاتی کہ اپنی خوشی کی خاطر بابا کا دل توڑ دیتی اور کیا اس کی خوشیاں بابا کی خوشیوں سے الگ تھیں؟

”مجھے معاف کر دینا اوزان۔ پلیز مجھے معاف کر دینا۔ بات انتخاب کی آگئی تھی۔ مجھے تم میں اور بابا میں سے کسی ایک کو چننا تھا اور میں نے وہی فیصلہ کیا جو ایک بیٹی کو کرنا چاہیے تھا۔ تمہیں میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ اس دل سے تمہاری یادیں مٹا دینا ناممکن ہے۔ تم ہمیشہ میرے دل میں رہو گے تمہاری جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ شہر دل کے دروازے اب کبھی کسی کے لیے نہیں کھلیں گے۔ میں نے زندگی میں جن دو

لوگوں کو شہر سے چھٹا کر دو دنوں مجھے بیک وقت نہیں مل سکتے تھے اور میں تقدیر سے لڑ نہیں سکتی۔“ وہ اس پیارے انسان کو دکھ دینے جا رہی تھی اور ایسا کرتے ہوئے خود اس کا اپنا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔

”اوزان! جو خواب ہم نے دیکھے تھے شاید ان کی تعبیر پانا ہمارے مقدر میں نہیں۔ بابا نے اپنا فیصلہ سنا دیا اور میں ان سے اختلاف کرنے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتی۔ مجھے معاف کر دیں مگر مجھ میں آپ کی ممی کی طرح اپنوں کو چھوڑنے کا حوصلہ نہیں۔ پلیز اس سلسلے میں مجھ سے مزید کوئی بات مت کیجیے گا میں کمزور نہیں پڑنا چاہتی۔“

آج اگر میں نے بابا کا مان نہیں رکھا تو ساری عمر خود کو معاف نہیں کر پاؤں گی۔ آپ کا بابا سے ملنا بے کار ہے۔ وہ ایک بار کسی بات کے لیے منع کر دیں تو ان کی نہ کوہاں میں بدلنا ناممکن ہے۔ اب وہ کبھی بھی نہیں مانیں گے۔ مجھے معاف کر دیں میں اپنا وعدہ نہیں نبھا پائی۔ میں اپنے تمام وعدے اور سارے عہد توڑ رہی ہوں۔“

آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ بہت مشکلوں سے وہ یہ الفاظ لکھ پائی تھی۔ کتنی مشکلوں سے اس نے خود یہ سب لکھنے پر آمادہ کیا تھا۔ اسی میل بھیجتے ہوئے کتنی بار اس کے ہاتھ کانپے تھے۔ یہ سب پڑھ کر اس پر کیا گزرے گی۔ وہ تو ایسے کسی جواب کی توقع بھی نہیں کر رہا ہو گا۔ اسے تو اس بات کا انتظار ہو گا کہ کب وہ اسے بابا سے ملنے کے لیے بلائے گی۔ ساری رات وہ بے چین رہی تھی۔ صبح وہ انسٹی ٹیوٹ جانے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ بابا ہی نے اسے چھوڑا تھا۔ خود کو معمولات زندگی میں الجھالینے کے باوجود دل کا ایک گوشہ مسلسل بین کر رہا تھا۔ اپنے ہی اندر سے ماتم کرنے اور رونے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ رات میں بابا اسے کھانا کھلانے باہر لے گئے تھے۔ اس کا من پسند اٹالین ڈنر۔

”آپ کی پسندنا پسند کا تو مجھے پتا نہیں تھا۔ بس جو

چیزیں مجھے پسند ہیں۔ وہ سب بنوائیں کہ آج آپ میری پسند کا کھانا کھا کر رہیں۔“

”کیا ہوا؟ کیا سوچنے لگیں؟“ یاباکی آواز اسے کسی یاد سے واپس کھینچ لاتی تھی۔

”کچھ نہیں بس ویسے ہی مجھے مرنا آتی کا خیال آ رہا تھا۔ اب کی بار نہیں کراچی کا چکر لگائے تقریباً ”سال ہوئے والا ہے۔“ حلق میں آنسوؤں کا چھند لگ رہا تھا۔ جلدی سے پانی کا گلاس بھر کر وہ پورا گلاس پی گئی۔

”تو تم مل آؤ“ بیابانے ایک نظر اس پر ڈال کر نوالہ منہ میں ڈالا تھا۔

”تمہیں میری کلاسز مس ہو جائیں گی۔“ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی تھی۔

”ایسا اس کے بعد آئیں کریم کھائیں گے اور گھر جا کر کوئی زبردستی سپینس مووی دیکھیں گے۔“ وہ پٹیا پلٹ میں ڈالتے ہوئے پروگرام ترتیب دے رہی تھی۔

”ہاں اور پھر جب اس میں کوئی قتل و قتل ہوتا ہوا دیکھ لو گی تو معصوم شکل بنا کر پایا آج میں آپ کے پاس سوؤں گی کوئی۔“ وہ اس کا فائدہ اٹھا رہے تھے۔

”صرف دو مرتبہ ایسا کیا ہے میں نے اور آپ بتاتے کتنا ہیں ناں اس بات کو۔“ وہ روٹھے لہجے میں بولی تھی۔ پھر کھانے کے بعد حسب پروگرام انہوں نے آکس کریم کھائی تھی اور گھبرا کر سسپینس مووی بھی دیکھی تھی۔ کمرے میں آتے ہی اس کے چہرے کی مسکراہٹ رخصت ہو گئی تھی۔

”پاپا مجھے معاف کر دوں۔ میں آپ کو دھوکا نہیں دے رہی لیکن اپنے دل کو سمجھانا میرے بس میں نہیں۔“ گھر کے سے باہر سہاؤری سے ہنستی نہماؤ طارق اب بے آواز تکیے میں منہ دیئے سسک رہی تھی۔ آج کل پاپا اسے روز کہیں نہ کہیں کو ٹھنک کے لیے لے جاتے تھے۔ کبھی سی ویو، کبھی الہ دین، کبھی کہیں دُور کرانے اور کچھ عرصے میں آنس کریم کھلانے۔

”میرا تم خوش ہونا“ بات میں اس پر دل کے
تے واکنش سوال کیا تھا کہ تم تجھے اور مجھ میں
”جی بابا میں بہت خوش ہوں۔“ کہہ کر بہاوری سے
مسکرا دیا کرتی تھی۔

چھ مہینے کا عرصہ پلک جھپکنے کی گزر گیا تھا۔ اس روز سڑے تھا۔ وہ سچی تیاریوں میں مصروف تھی جب بابا بھی اگر اس کی مدد کرانے لگے تھے۔ "لاؤ میں ہر احتیاجی بنادوں۔" وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے تھے۔ بابا کو کوئی فتنہ بہت پسند تھے اور وہ وہی پکانے میں مصروف تھی۔

”تمہارے لیے سکندر کا پوزل آیا ہے۔“ کچھ دیر بعد انہوں نے اسے مخاطب کیا تھا۔ ”جانتی ہو نا سکندر کو؟ وہ احمد کا چھوٹا بیٹا جو آرمی میں ہے۔“

انہوں نے اپنے دوست احمد علی خان کا نام لیا جنہیں نراء بھی بہت اچھی طرح جانتی تھی۔ کئی مرتبہ بابا کے ساتھ ان لوگوں کے گھر مختلف فنکشنز میں جانا ہوا تھا۔ خود احمد انگل اور آئی بھی کئی بار ان کے گھر آچکے تھے۔ فنکشنز میں شرکت کرنے کی وجہ سے وہ ان کے گھر کے تقریباً تمام افراد سے ملی ہوئی تھی۔ مگر خاص طور پر سکندر نام کا کوئی بیٹا اسے بالکل یاد نہیں تھا۔ ان کے پانچ بیٹے اور ایک بیٹی بھی اور فردا فردا سب کے نام اسے یاد نہیں تھے۔ اس کی جانب سے کسی سوال کا انتظار کرتے رہنے کے بعد وہ خودی مزید بتانا شروع ہو گئے۔

”ایک سال سے احمد اور بھانجی میرے پیچھے بڑے ہیں۔ رات احمد کا فون آیا تھا کہ رہا تھا کہ ایک آدھ روزیں وہ لوگ باقاعدہ رشتے لے کر آچاہو رہے ہیں۔ پہلے تو میں تمہارے کورسز کا کہہ کر ٹال رہا ہوں اب تم بتاؤ کیا جواب دوں؟“

وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بول رہے تھے۔ پشت
ان کی طرف ہونے کے باوجود اس کا چہرہ بخورا بخورا
نظر آ رہا تھا اور وہ اس پر لکھا ہر لفظ بڑھ لیتا جا رہا تھا۔
”ایسا! میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ جتنے تو یاد بھی نہیں کہ

اس کی بجائے اچھا اسماٹ اور پینڈ سم
 کی بار بھی ملنا ہوں مجھ کو اچھا ہی لگتا ہے۔
 "وہ ہرے وحشیہ کی پلیٹ اس کے
 دل میں لگاتے ہوئے بولے تھے۔

اب کافیلہ ہو گا وہی میرا بچہ ہو گا مجھے پتا
لے لے کبھی غلط نہیں سوچ سکتے۔" وہ ان
ظہروں کے جواب میں آتشکی سے سرخ ہو کر

”کہا کہ میں اس سے کہہ آ جاؤ؟“ وہ دوبارہ پوچھنے لگا۔

۱۱۔ شاید امر انکل کے ہاں اسی روز فون کر گیا تھا
 ۱۲۔ انکل اپنے بڑے بیٹے بابو اور سوشائیز کے
 ۱۳۔ ساتھ ہی روز ان کے گھر آ گئے تھے۔ ان کے ہمراہ
 ۱۴۔ ایک اور پھلوں کے لوازمات دیکھ کر بابا بھوکھا لگے

”سب کیا ہے؟ ابھی اس سب کی کیا ضرورت
 ہے؟“ انہوں نے اصرار انکل سے کہا تھا۔

دن گن گن کر اسی دن کا انتظار کر رہے تھے طارق بھائی۔ اب آپ ہرگز کوئی اعتراض کرنے کا حق نہیں رکھتے۔ آپ ہمارے بارے میں اور ام آپ کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں کسی چار دن کی ضرورت تو ہے نہیں۔ بس آج ہی صبح ہی آج کے دن کے لیے کریں۔" آغشی نے مسکراتے ہوئے کہا

”وہ سب تو ٹھیک ہے، لیکن ابھی میں نے اس
 خط میں ہوا اور عدیل سے بات نہیں کی۔“ بیانیے
 اس سولت سے سمجھا دیا تھا۔

اس وقت اس نے بطور
اس کے ہوا تھا۔ اسے لگا کر بیاہ کر کے ہوئے
اس کے نکاح ہوئی تھی۔

”آپ کی یہ بیٹی آج تین خیموں پر سولے سے میرا انتخاب لکھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ جب میرا سکندر اس لائق ہو جائے گا تو آپ سے نساء گویا گان لوں گی۔“ بابلان کی بات پر فخر سے مسکرا دیئے تھے۔

اپنی اولاد کی تعریف ہر ماں باپ کے لیے اتنے ہی فخر کا باعث ہوتی ہے۔ کوئی آپ کی اولاد کی تعریف کر رہا ہو تو لگتا ہے کہ آپ کی اپنی ہی تعریف ہو رہی ہے۔

”ابھی اس بات کا سب سے بڑا گواہ تو میں ہوں۔
سب سے پہلے جب تمہاری بھانجی نے مجھ سے یہ
بات کہی تو اس وقت سکندر انٹر میں تھا۔ میں نے کہا
ابھی اسے کسی قابل تو ہو جائے۔ وہ وقت آنے پر

طارق سے بات کر سں گے۔" انکل نے بابا کو مخاطب کیا تھا۔ نفیس چچی کیسے ان لوگوں کی باتیں سن رہی تھی۔ بابا نے ان لوگوں کے جانے کے بعد اس سے ایک مرتبہ پھر پوچھا تھا۔

”تم اگر چاہو تو سکندر سے مل لو۔“ وہ بغور اسے دیکھتے ہوئے بولے تھے۔

”ایسا اس کی ضرورت نہیں۔ آپ مطمئن ہیں تو پھر بس سب ٹھیک ہے۔“ وہ سر جھکا کر آہستہ آواز میں بولی تھی۔ وہ وقتی دیر تک اس کا جھکا ہوا سر دیکھتے رہے تھے۔

♥ ♥ ♥ ♥
فنکشن اختتام پر ہو چکا تھا۔ قریبی رشتے داروں
کے علاوہ تمام لوگ جا چکے تھے۔ مہوا سے کمرے میں
چھوڑ گئی تھی۔

”ہم کپڑے بدل کر فریض ہو لو، میں گرما کر مر جائے بنا کر لاتی ہوں۔“ بلکہ ایسا کرتی ہوں کہ بابا وغیرہ کو بھی بلا لاتی ہوں۔“ وہ تیز حیز بوتی ہوئی کمرے سے نکل آئی تھی۔ اس کے جاتے ہی وہ جلدی جلدی تمام جیولری اتارنے لگی تھی۔ تیار ہونے کے بعد سے اس نے خود کو ایک بار بھی آنکھ میں نہیں دیکھا تھا۔ سب نے اس کی بہت تعریفیں کی تھیں مگر وہ خود اپنے ہی سراپے سے نظر سچا رہتی تھی۔ خود کو اس روپ میں کسی اور کے جاکر سے، جتنا بہت مشکل تھا۔ راز راز مگر کہنے

دھوئے ہوئے اسے محسوس ہوا کہ غل کے ٹھنڈے پانی کے ساتھ کچھ گرم قطرے بھی اس کے چہرے کو جھگو رہے ہیں۔ مہو کے آنے کے بعد سے تو وہ اپنے کمرے میں بھی مختلط ہو کر رہتی تھی۔ مہو نے واس روم کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔

”کیا اٹھانے لگی ہو؟ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“ وہ جلدی سے چوہ خشک کر لی یا ہر انگلی تھکی۔ کمرے میں بابا عدیل بھائی ٹوپیہ اتنی، انگل اور مہو موجود تھے۔ مہو اپنی ہنگامہ پرور فطرت کے عین مطابق نان اسٹاپ ہوئے اور سب کو چائے سرو کرنے میں مصروف تھی۔ ”مجھے تو سکندر بہت پسند آیا۔ ہماری نماء کے ساتھ انتہائی ذہینت، ہندو سوٹ کر سکتا تھا۔“ بابا کے استفسار پر عدیل بھائی بولے تھے۔

”میں نے تو اسلام آباد آنے کی دعوت بھی دے دی، تو یہ اتنی نماء سے مخاطب ہوئی تھیں۔“

”میں نے اس سے کہا کہ ابھی ہماری نماء کو اسلام آباد بہت اچھا لگا تھا۔ شادی کے بعد سب سے پہلے تم دونوں اسلام آباد ہی آنا۔“ وہ نماء کی طرف شرارتی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی تھیں۔

”جی نہیں نماء سب سے پہلے دہا آئے گی۔“ مہو لڑنے والے انداز میں چلائی تھی۔

”تم دونوں کیوں جھگڑ رہی ہو۔ اس سے پوچھ لو کہ وہ کہاں جانا چاہتی ہے۔“ انگل بھی گفتگو میں شریک ہوئے تھے۔ صبح سے اب تک وہ جن کیفیات سے گزری تھی اسے لگ رہا تھا کہ وہ بس اب بہت ہار دے گی۔ سب فرصت سے بیٹھے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ بابا کی نظریں خود پر جمی ہوئی تھیں کہ اسے خبر بہت ہو رہی تھی۔ وہ بابا سے کس طرح خود کو چھپائے۔

”مارے نماء اسلام آباد کا ہی نام لے گی۔ وہاں سے چلے وقت ایئر پورٹ تک پر اس نے مجھ سے یہی کہا تھا کہ اتنی مجھے آپ کا شہر بہت اچھا لگا ہے۔ یہاں سے جانے کو دل ہی نہیں چاہ رہا۔“ تو یہ اتنی کی بات پر وہ یں کی بیٹھی رہ گئی تھی۔ وہ دونوں آپس میں ابھی ہوئی تھیں اور عدیل بھائی اور انگل بھی ان کے جھگڑے کو

خوب ہوا سے دے تھے اور بابا؟ اس نے سر اٹھا دیکھا تو نظریں سیدھی ان کی نظروں سے لگ کر لی تھیں۔ متکئی کی تاریں خطے کرنے کے بعد جب بابا نے اس سے پوچھا تھا۔

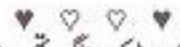
”نماء تم خوش ہو نا۔“ تو وہ کہتے مطمئن انداز میں انہیں یقین دلانا لگی تھی۔

”جی بابا میں خوش ہوں۔“

”تم مجھ سے ناراض تو نہیں؟“ انہوں نے مزہ پوچھا تھا۔

”آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں بابا۔ بھلا میں آپ سے کبھی ناراض ہو سکتی ہوں۔“ وہ ان کے گلے میں پانچیں ڈال کر مسکرائی تھی اور اس وقت اسے خود اپنے ہی کئے لفظوں کا بھرم رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔

”یا اللہ مجھے استقامت دے۔“ بابا نے میری آنکھوں میں آنسو دیکھ لیے تو وہ بری طرح دھڑک رہی تھی۔ میں نے بابا کی بات اس لیے تو نہیں مانی تھی کہ بعد میں اپنی او اس شکل دکھا کر انہیں پریشان کروں۔ وہ اپنے رب سے ثابت قدمی اور استقامت کی دعا مانگ رہی تھی۔ اس کی غیر معمولی خاموشی کو سب شرم پر محمول کر رہے تھے۔ یہ بھی مہو کے ہوتے ہوئے کسی اور کے بولنے کا موضوع ذرا کم ہی آیا کرتا تھا۔



بابا بھائی کے بیٹے کی سالگرہ تھی۔ اپنی متکئی کے بعد وہ آج پہلی مرتبہ ان لوگوں کے گھر آئی تھی۔ سکندر پشاور میں پوسٹڈ تھا۔ متکئی کو تین ماہ گزر جانے کے باوجود ان دونوں کی اب تک آپس میں ایک بار بھی نہ تو کوئی ملاقات ہوئی تھی اور نہ ہی فون پر بات ہوئی تھی۔ احمد انگل کے ہاں پہنچے تو سب نے ہی ان لوگوں کا رجوش خیر مقدم کیا تھا۔

”اتنی اسے اپنے مختلف ٹپے والوں سے متعارف کروا رہی تھیں جب سکندر انہیں کواڈرنا اس طرف آیا۔ اسے آنا دیکھ کر نہ دل کی دھڑکن تیز ہوئی نہ محسوسات میں کوئی تبدیلی آئی۔ وہ اسی طرح خاموش

رہا۔ اسے کچھ کہنا نہ سہا تھا۔ اسے وہ کہہ دیا کہ آئی سے بات کرنے لگا تھا۔ ڈنر کے بعد اس کی ٹیبل پر آیا تھا۔ بابا اپنے دوستوں کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ اس وقت ٹیبل پر وہ ایسی بیٹھی

تھی کہ ان لوگوں کی شادی کچھ زیادہ ہی مشرقی طریقے سے ہو رہی تھی۔ وہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھی تھی۔ وہ اس بات کے جواب میں کیا کہتی سو

چلائی۔ اسے بار بار چہنیوں میں آیا تھا تو سوچ رہا تھا کہ ہم اسے کس طرح یا ڈنر کرنے جائیں مگر جی بات تو یہ کہ اسے اہل سے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں وہ ماٹرنہ نہ کرے۔ وہ ہنسی کمری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے اہل ہوا رہا تھا وہاں سے بھاگ جائے۔

”تم ناؤ اگر میں انگل سے پریشان ہوں تو وہ ناراض تو نہیں ہوں گے؟“ وہ سوالیہ انداز میں پوچھ رہا

تھا۔ اسے حاد تو نہیں جو آپ ان سے اتنا ڈر رہے۔ وہ انگل بول پائی تھی۔ وہ اس کے جواب پر

”ابھی اہل بار جب میں کون گاتا کہیں باہر چلیں گے۔ اس بار تو صرف دو دن کے لیے آیا ہوں۔ کل وہاں چلا ہوں گا۔ ویسے بھی مجھے تو اتنی زیادہ اہمیت نہ ہے۔“ اسے احساس اعتراض ہے۔ ہم لوگ ایک دوسرے سے اتنا نہ عادتوں اور مشاغل وغیرہ کے بارے میں بات نہیں جانتے۔ وہ افسردہ شکل بنا کر بولا تھا۔ اس طرف آنے دیکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔ اسے یہی سکندر نے سنجیدہ اور مودب شکل میں کہا تھا۔ اس کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے تو وہ غلطی سے اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔

”تم بہت اچھے ہو سکندر تمہاری دل؟ اس کا میں کیا کہوں۔ کیا کہوں کچھ بھی میرے بس میں نہیں۔“ اسے میرے اختیار میں تھا میں نے کیا۔ مگر اپنے دل کو کچھ سمجھاؤں۔ وہ کوئی نصیحت، کوئی بات سننے

کے لیے تیار نہیں۔“ ان دونوں کی باتوں سے بے نیاز وہ اپنی ہی سوچوں میں الجھی ہوئی تھی۔

”مجھ سے کسی نے کہا تھا کہ محبت وہ ہوتی ہے جب آپ کو کوئی اپنے ہی وجود کا حصہ ٹھکنے لگے۔ جب کوئی دوسرا اپنے ہی وجود میں دھرتا اور سانس لیتا محسوس ہو اور جو مجھے میرے وجود کا حصہ لگتا ہے، جو مجھ میں دھرتا اور سانس لیتا ہے وہ تم نہیں ہو۔ کیا کہوں اس مقام پر میں بے بس ہوں۔“

واپسی میں گھر جاتے ہوئے بھی وہ چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ چپ صرف وہی نہیں بلکہ بابا بھی بالکل خاموش ہیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے اس سے اس کی خاموشی کی وجہ بھی دریافت نہیں کی تھی۔

”بابا آکس کریم کا موڑ ہو رہا ہے۔“ وہ خود کو چیخ رہی تھی۔ اسے مسکرائی تھی ان کے خاموشی سے ایک آکس کریم پارلر کے آگے گاڑی روک لینے پر وہ جہان رہ گئی تھی۔ انہوں نے اپنی عادت کے مطابق کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ جبکہ وہ اس کے سروپوں میں آکس کریم کھانے پر بہت ناراض ہوتے تھے۔

”آپ نہیں لیں گے؟“ صرف اپنے لیے آرڈر ہوتا دیکھ کر وہ بولی تھی۔ جوں جوں انہوں نے فنی میں سر ہلا دیا تھا۔ ان کے رویے پر ابھ رہی تھی۔

”کیا بابا مجھ سے ناراض ہیں؟“ میں کس بات پر؟“ وہ مسلسل سوچے جا رہی تھی۔ آکس کریم بھی اس نے بے دلی سے کھائی تھی۔ گھر آکر بابا فوراً ہی اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔ وہ خود بھی سونے کے لیے لیٹ گئی تھی۔ بابا کی طرف سے فکر، سکندر اور اپنی آنے والی زندگی کی منشن، وہ بہت مضطرب تھی۔ ایک جھوٹی اور مصلحت آمیز زندگی گزارنے کا خیال مسلسل رلا رہا تھا۔

سونے کی کوشش کرتے ہوئے آنکھیں بند کیں تو روز کی طرح آج پھر وہ خیالوں کی وادی میں چلا آیا تھا۔ اس نے بے اختیار خبر آکر آنکھیں کھول دی تھیں۔

آج سکندر سے ملنے کے بعد اس کا خالوں کی میں سوچا جانا نماء کو بددیانتی محسوس ہو رہا تھا۔ مگر بہت کوشش کے باوجود بھی وہ اس کے تصور سے چھپتا نہیں چھڑا پاتی تھی۔

”میرا خیال ہے عید کے بعد وہ لوگ شادی کی تاریخ رکھنے کی بات کرنے والے ہیں۔“

بابا نے میگزین سے نظریں ہٹا کر اسے مخاطب کیا تھا۔ وہ پیچہ اور پین لیے بیٹھی تھی۔ اس کا پسندیدہ کوکنگ پروگرام آرہا تھا۔ بابا کے لیے سحری اور افطار میں سنت ٹی مزے دار ڈشز بنانے میں اسے بہت مزہ آتا تھا۔ روزہ افطار کرنے کے بعد نماز کے فوراً بعد وہی وہ لوگ کھانا کھالیا کرتے تھے۔ پھر چائے پیتے یا بابا آؤتج کے لیے چلے جاتے اور وہ بھی نماز پڑھنے لگتی ہو جاتی۔ رمضان کا وہ سرا عشرہ ختم ہونے والا تھا۔

”اسیاد کرو تم دوبا ہو آؤ۔ مہو اور اپنی پھوپھو کے ساتھ مل کر شادی کی شاپنگ شروع کرو۔ اچانک اگر ان لوگوں نے شادی کی جلدی مچائی تو اکیلے تیری کرنا بہت مشکل ہو جائے گا۔“ چائے کاسب لیتے ہوئے انہوں نے کہا تو وہ فی وی سے توجہ ہٹا کر ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”کہیں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں شاپنگ بیس کر لوں گی۔“

”نہیں، ابھی۔ ایک تو ایسے تم کو نہیں یادو گی۔ پھر
 سو کی چو اس بھی اچھی ہے۔“ ان کے بونے کا
 اسٹائل ایسا تھا جسے وہ یہ بات پہلے ہی طے کر چکے ہوں
 اب صرف اسے انظار کر رہے تھے۔ اس کا ایسا کوئی
 دل نہیں چاہ رہا تھا کہ یہ سوچ کر چپ ہو گئی کہ بابا ایسا
 چاہ رہے ہیں۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ بابا شاید عید کے بعد
 اسے بھیجیں گے مگر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ
 چوتھی دن ٹکٹ لے آئے۔
 ”مجھے بھی افس کے کام سے ہٹا کر جانا ہے۔ ہفتہ
 دس دن میں جتنی شاپنگ ہو سکتی ہے کر لیتا۔ باقی پھر

عید کے بعد وہ جیسے ہے۔
 ”ایسا عید تو ہم ساتھ کریں گے؟“ اسے فکر لاحق ہوئی تھی۔
 ”ہاں انشاء اللہ عید ساتھ کریں گے۔“ انہوں نے اطمینان دلایا تھا۔

جلدی جلدی تیاری کر کے وہ دوبا اور بابا بنگاک
روانہ ہوئے تھے چلتے وقت تک وہ اُمس مختلف
ہر باتیں دیتی رہی تھی۔
”سحری میں لاوڑ پینا مت بھولیے گا“ خدا حافظ
کہتے ہوئے وہ بولی تھی۔

”میں تم بے فکر رہوں۔ میں بالکل اچھی طرح اپنا خیال رکھوں گا۔ بس تم ایسی شاپنگ کر لیتا جو میری مٹی کے شایان شان ہو۔“ سنجو سی وکھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جو چیز اچھی لگے خرید لیتا۔ وہ اسے پیار کرتے ہوئے پر شفقت لہجے میں بولے تھے۔

”میلو“ فون کی تیل پر اس نے ریسور اٹھایا تھا۔
 دوسری طرف سے ایک ناناؤس آواز سنائی دی تھی۔
 ”میلو“ میں حارق اقبال بات کر رہا ہوں۔“
 ”لوہ آہ!“ وہ فوراً ہی پہچان گیا تھا۔

”میں یہاں ایئر پورٹ سے بول رہا ہوں۔ آپ کا
ایئر ریس تو میرے پاس لیکن چونکہ مجھے یہاں کے
راستوں کا بالکل کوئی آئیڈیا نہیں اس لیے اگر آپ
تھوڑا بہت گائیڈ کریں تو وہ لن کی بات مکمل ہونے
سے پہلے ہی بول رہا تھا۔“

”آپ ہیں صبر میں آتا ہوں۔“
 ”دیکھیں آپ مجھے۔“ ان کا ہلہ پھر اوصور اڑ گیا۔
 ”پر فکر ہیں میں آپ کو پہچان لوں گا۔ آپ بس
 ہیں رک کر میرا انتظار کریں۔“ وہ سلسلہ منقطع کر چکا
 تھا۔

اپنی طرف آتے اس دورانِ قیامت و جہنم کے کہ انہوں نے چونک کر غور سے دیکھا تھا۔ وہ دور سے ہی انہیں کی طرف دیکھتا ہوا آ رہا تھا۔

جواب میں انہوں نے بھی اپنا

ان کے لئے کہ ان سے لے کر غور و چالنے لگا تھا۔ انہیں اس
مکمل انداز پر حیرت ہوئی تھی۔ وہ اس طرح
کہا تھا کہ وہ باقاعدہ اسے بتا کر آئے تھے اور وہ
ان کی آمد کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ دونوں
ساتھ ساتھ چلتے گاڑی تک پہنچے تھے۔

اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

کافی دور ہے۔ ” کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ کہتا ہے۔

اول بات نہیں۔ اصل میں میں ترکی زندگی میں
آ گیا ہوں اور پہلی مرتبہ بھی توج سے کم پیش
پس سال پہلے آیا ہوں گا۔ اس لیے یہاں کے
مرد و عورتوں کی بنا پر ایسے ایسے رورٹ سے
میں شکاری کا سامنا تھا۔ ورنہ میں آپ کو زحمت
نہ دیتا۔ ”وہ بے تکلف انداز میں بولے تھے۔ بقیہ تمام
مرد و عورتوں سے کتنا تھا۔ گاڑی گیٹ سے اندر لاکر
آئے۔ انہیں اتارنے کا کہہ کر وہ خود بھی اتر گئے۔

اور ہمارے لیے ایک قدم پیچھے چلتے ہوئے اس گھر کا
 اور ہمارے لیے رہے تھے بڑا سا کشادہ اور قیمتی
 مکان۔ آج اس مکان مکمل ستارے میں ڈوبا
 ہوا تھا۔ ایسا گھر ہر گھر کے لیے ایک نمونہ
 تھا۔

آپ یقیناً سفر کی محکمہ اتارنا چاہتے ہوں گے۔
 اس لئے واش روم ہے آپ فریش ہو لیں۔ ویسے
 آپ نے کہا تھا تو کہا کیا ہے ناں؟ وہ تو اب میزبان

بھاتا ہوا پوچھ رہا تھا۔

”ہاں روزہ جہاز میں ہی افطار کیا تھا۔“ وہ اپنی نظریں اس پر مسلسل جمائے ہوئے تھے۔

”چائے تو پیئیں گے نا آپ؟“ اس نے مزید پوچھا تھا۔ ان کے سر ہلا دینے پر وہ فوراً یہی کمرے سے نکل گیا تھا۔ وہ کمرہ غالباً ”کیسٹ روم“ کے طور پر ہی استعمال ہوتا تھا۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر نکلے تو ان کا سوٹ کیس بھی کمرے میں ہی چکا تھا۔ وہ بیڈ پر بیٹھنے سامنے دیوار پر خوبصورت فریم میں لگی آیت انگریزی کو دیکھ رہے تھے جب دروازہ ناگ ہوا تھا۔ آگے آگے وہ خود اور پیچھے ٹرے اٹھائے ملازم اندر آ گیا تھا۔ ٹرے اس کے ہاتھ سے لے کر سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس نے ترکی زبان میں غالباً ”ملازم سے یہ کہا تھا کہ چائے وہ خود بنائے گا۔ اس کے جاتے ہی وہ چائے کپوں میں ڈالنے لگا تھا۔

”آپ چینی کتنی لیس گئے؟“ وہ بیڈ کے سامنے رکھی
کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔

”ایک چمچ“ انہوں نے جواب دیا تو وہ شکر ادا کر
کب ان کی طرف بڑھا تا ہوا ہوا۔

”یہ اخروٹ ضرور ٹرائی کیجئے گا“ میرا دوست
ایران سے لایا تھا بہت مزے کے ہیں۔ ”چائے کا کپ
انہیں دے کر اس نے ڈرائی فروس کی بیڑی سی پیٹ
جس کے مختلف خانوں میں اخروٹ بکجو، مکین، پستے
اور پادام رکھے ہوئے تھے ان کی طرف بڑھائی۔ وہ
مسمان لوازنی کا مظاہرہ کرتے اس شخص کو تھیر سے دیکھ
رہے تھے۔

سال بھر پہلے اسی شخص سے وہ لگا تار تین روز تک اپنے دفتر میں ملنے سے انکاری رہے تھے۔ پہلے روز ریسپنشنسٹ کی زبانی اوزلن دواسف نامی شخص کی آمد اور ساتھ ہی وزٹنگ کارڈ دیکھ کر: "ہوں نے بغیر ایک لمبے کی دریا لگائے اس سے نہ ملنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ اس شخص سے نہیں ملنا چاہتے تھے۔ اپنے میٹنگ میں مصروف ہونے کا کہلو کر انہوں نے اس سے ملنے سے معذرت کہلوادی تھی۔" ان کا خیال تھا کہ وہ اتنا سمجھ

دار تو ہو گا ہی کہ ان کے گریز کو سمجھ کر وہاں نہ آئے مگر ان کی یہ خام خیالی اگلے روز غلط ثابت ہوئی تھی۔ آج انہوں نے صاف صاف لفظوں میں ملنے سے منع کر دیا تھا۔ انہیں اس شخص کی ہتھالی پر حد درجہ غصہ آیا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات تھی جب نساء اسلام آباد سے آئی تھی اور وہ اسے منع کرنے کے بعد خود بھی بے حد ڈسٹرب تھے۔ تیسرے روز اس کی آمد انہیں اسٹےجے خاصے اشتعال میں مبتلا کر گئی تھی۔ ”جب میں نے کل کہہ دیا تھا کہ مجھے اس شخص سے بالکل بھی نہیں ملنا تو پھر میرے پاس اس کی آمد کا پیغام لانے کی کیا ضرورت ہے۔“ وہ ٹیکہ مری پر چلائے تھے۔

”سرا میں نے ان سے یہی کہا تھا لیکن وہ جواب میں کہنے لگے کہ آج وہ آپ سے ملنے نہیں بلکہ آپ کو یہ لفاظی دینے آئے ہیں۔ پھر وہ یہ لفاظی پکڑا کر فوراً چلے گئے۔“ ٹیکہ مری کی منتناقی آواز سن کر انہوں نے اپنے غصے کو باتے ہوئے لفاظی اس کے ہاتھ سے لے لیا تھا۔ کتنی دیر تک لفاظی ہاتھ میں لیے رہنے کے بعد انہوں نے اسے کھول کر دیکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔

”سرا میں نے آپ سے ملنے کی بہت کوشش کی مگر شاید خدا کو ہمارا ملنا فی الحال منظور نہیں۔ میں نے اپنا ٹرانسفر واپس استنبول کر دیا ہے۔ پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ ابھی ہمیں زندگی میں ایک بار ضرور ملنا ہے۔ اپنے اس یقین کی وجہ میں نہیں جانتا مگر مجھے لگتا ہے کہ ہم پلیس کے ضرور۔“

اپنے اسی یقین کے سارے میں آپ تک اپنا استنبول کا ایئر بیس اور فون نمبر پتہ پتہ چاہتا تھا آج دس سال بعد لیکن میں آپ کا انتظار کروں گا۔ اوزان واسف۔“

اس کا کیا متنبال کر رکھنے کی بجائے ضرورت تھی۔ وہ جانتے نہ تھے کہ ایک سال بعد وہ خود اپنے ہی ایئر بیس پر فون کر کے خود کو اس سے ملنے پر مجبور پائیں گے۔ ایسا کرنے پر نہ انہیں نساء نے مجبور کیا تھا نہ اوزان نے نہ ہی کسی اور نے بلکہ خود ان کے اپنے دل نے۔ ”آپ کو یہ یقین کیوں تھا اوزان کہ میں آپ سے ملنے ضرور آؤں گا؟“ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یا آخر اس بات کی طرف آگئے تھے جو وہ شاید خود بھی ان سے سنا چاہتا تھا۔ ان کے سوال پر وہ چاہا کہ آپ واپس ٹرے میں رکھتا ہوا بڑی سنجیدگی سے بولا۔

”نساء نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے بابا اسے بہت پیار کرتے ہیں اور جن سے ہم بہت پیار کرتے ہیں انہیں ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔“ وہ اس کے پر اعتماد انداز پر ٹھنک کر اس کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ وہ نہ گھبرایا ہوا لگ رہا تھا نہ نروس۔ بے تحاشا انہیں آنکھیں اعتماد لیے ہوئے تھیں۔

”آپ کو یقین کیونکر ہے کہ خوشیوں کا دار و مدار آپ کے ساتھ ہونے پر ہے۔ ہو سکتا ہے ایسا نہ ہو۔ اگر میں آپ سے کہوں کہ وہ آپ کے بغیر بھی بہت خوش ہے تو؟“ وہ بڑی سنجیدگی سے دریافت کر رہے تھے۔ انداز سے جھٹلاتے والا تھا۔

”اس لیے کہ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اسے ساری دنیا میں سب سے زیادہ پیار اپنے بابا سے ہے اور بابا سے ذرا کم مگر جو اسے بہت اچھا لگتا ہے وہ میں ہوں۔ اور جو لوگ ہمیں بہت اچھے لگتے ہوں ہم خوش بھی انہیں کے ساتھ رہتے ہیں۔“ وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے صاف گوئی سے بولا تھا لہجہ بہت شائستہ اور با اوب ہونے کے ساتھ ساتھ اعتماد سے بھرپور تھا۔

”اور اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ آپ اسے ہمیشہ خوش رکھیں گے؟“ وہ اپنے مخصوص دو ٹوک انداز میں مخاطب ہوئے تھے۔

”میں اپنی بیٹی سے بہت محبت کرتا ہوں اور ہر باپ

اس کے اندر اتنی ساری خوبیوں کے ہوتے ہوئے بھی میں آپ کو اس پر ترجیح کیوں دوں؟ کیا آپ اپنے حق میں کوئی ایسی بات جانتے ہیں جو آپ کے خیال سے آپ کو اس سے ممتاز کرتی ہو۔ جس کی بنیاد پر میں آپ کو اس کے مقابلے میں ترجیح دے سکوں۔“

پھر وہی بار بار عجب اور بے پناہ سنجیدہ لہجہ تھا۔

”میں میں ایسی کوئی بات نہیں جانتا۔ اس لیے کہ میں نہ پاکستانی ہوں نہ آپ میری فیملی کو جانتے ہیں اور میرا مسلمان ہونا بھی آپ کی نظموں میں مشکوک ہے۔ اور صرف ایک واحد بات جسے میں اپنے حق میں سمجھتا ہوں اس پر شاید آپ یقین نہ کریں۔“ کیونکہ آپ کی خواہش کے مطابق میں اپنی اس بات کا کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکوں گا اور اگر پیش کرنے کی کوشش کروں تو شاید آپ اسے تسلیم نہ کریں۔“ وہ بہت دیر بعد جھکا ہوا سرا اٹھا کر آہستہ آواز میں بولا تھا۔

”آپ کے یہ تمام اعتراضات مجھے نساء نے نہیں بتائے۔ اسلام آباد سے آنے کے بعد میرا اس سے بھی کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ آخری بار اس نے مجھے اسی میل کر کے آپ کے انکار کا بتایا تھا اور اس میں بھی کوئی وجہ نہیں لکھی تھی۔ مگر میں نے پاکستانی پچر بہت قریب سے دیکھا ہے۔ میری مٹی خود پاکستانی تھی مجھے اندازہ ہے کہ آپ کو میرے بارے میں یہی اعتراضات ہوئے ہوں گے۔“ وہ اس کی فہانت کے معترف ہو گئے تھے ان کے چہرے پر لکھی حیرت وہ فوراً بھانپ گیا تھا اور اسی لیے خود ہی جواب بھی دے دیا تھا۔

”بالکل درست مجھے یہی اعتراضات تھے۔“ وہ اتنی دیر میں پہلی بار ذرا سا مسکرائے تھے۔

”لیکن وہ کون سی بات ہے جسے آپ اپنے حق میں سمجھتے ہیں لیکن میری خواہش کے مطابق اس کا کوئی ثبوت دینے سے قاصر ہیں۔“ ان کے سوال پر وہ بے ساختہ بولا تھا۔

”کیا آپ میری بات کا یقین کر لیں گے؟“

”یہ سوال کل از وقت ہے۔ آپ بات جانتیں میں

یقین کروں گا یا نہیں اسے رہنے دیں۔" وہ ذرا سا رٹیکس ہو کر بیٹھے ہوئے بولے تھے۔
"محبت۔" وہ کمرے کے لیے بولا تھا۔

"محبت ہی وہ بات ہے جو مجھے اپنا سب سے بڑا ہتھیار اور اپنے حق میں سب سے بڑا پس پوائنٹ محسوس ہوتی ہے۔ وہ جو کوئی بھی ہے اتنی ساری خوبیوں کے باوجود بھی کم از کم محبت کے معاملے میں مجھ سے نہیں جیت سکتا۔ پورا ایک سال ہو گیا میں اس سے نہیں ملا اس کی آواز نہیں سنی۔ آنے والے وقت میں بھی ایسی کوئی امید نظر نہیں آتی مگر پھر بھی میں نے ہر لمحہ ہر بل اس محبت کو اپنے دل میں پہلے سے بھی زیادہ شدید پایا ہے۔ اتنا شدید کہ مجھے اپنے گھر کی دیرانی پری نہیں لگتی۔ میں نے اس سے ملنے کے بعد پھر بھی ایک لمحے کے لیے بھی کسی اور کے بارے میں نہیں سوچا۔ آپ کو شاید میری یہ بات اچھی نہ لگے اور شاید جھوٹی بھی مگر میں نے بار بار اپنے گھر میں تھابیٹھے اس کی موجودگی محسوس کی ہے۔ اسے اپنے آس پاس چلتا پھرتا اور ہنسنے سنا ہے۔"

وہ بہت ہی آہستہ آواز میں کچھ سوچتا ہوا بول رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اس وقت بھی خود کو کسی ایسی ہی کیفیت سے گزر رہا ہو۔ وہ بہت دیر تک اسے ایک ٹک دیکھتے رہے تھے۔ پھر ایک گہری سانس لیتے ہوئے اس سے بولے۔

"ویسے تو میں نے ہوٹل میں اپنے لیے روم بک کروایا ہوا ہے۔ مگر اب چونکہ رات بہت ہو گئی ہے تو میرا خیال ہے آج رات میں یہیں ٹھہر جاؤں۔ اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو؟" وہ کسی خیال سے چونک کر ان کی بات سننے لگا تھا۔ ان کا جملہ مکمل ہوتے ہی وہ ایک دم گڑبڑا کر بولا تھا۔

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟ آپ میرے لیے بہت قابل احترام مہمان ہیں۔"

"میرا خیال ہے رات بہت ہو گئی ہے۔ صبح سحری کے لیے بھی اٹھنا ہو گا۔" وہ جواب میں جمائی روکتے ہوئے بولے تھے۔ انٹرویو ختم ہو چکا تھا اب امیدوار کو

جانے کے لیے کہا جا رہا تھا۔ اس طرح ایک انٹرویو دینے والا اپنے انٹرویوور کے چہرے پر اپنے بارے میں آخری تاثرات جانچتا چاہتا ہے ایسے ہی اس نے بھی ایک نظر انہیں بغور دیکھا تھا۔

"آپ یقیناً بہت مجھے ہوئے ہوں گے۔ آرام سے سو جائیں۔ سحری میں میں آپ کو جگا دوں گا۔" وہ انہیں شب بخیر کہتا کمرے سے نکل گیا تھا۔
خیر تو خیر انہیں کیا آتی تھی۔ بستر لیٹے وہ بھی نہاد اور کبھی اوزان ہی کو سوچے جا رہے تھے۔

"پاپا وہ بہت اچھا ہے۔ بالکل آپ کی طرح۔ آپ اس سے ملیں گے تو آپ کو یقین آجائے گا کہ میں نے اس کے بارے میں جو کچھ بھی کہا ہے وہ اس سے بھی بڑھ کر اچھا ہے۔" نہاد کی پر جوش سی آواز سامعین میں دس گونج رہی تھی۔

"ہاں میری جان تم ٹھیک تھیں اور میں غلط۔ وہ واقعی بہت اچھا ہے۔ ہر لحاظ سے میری بیٹی کے لائق ہے۔" وہ اپنی جیتنی بیٹی کو تصور میں مخاطب کیے بیٹھے تھے۔

"ہم اپنی اولاد کو سب کچھ دیتے ہیں۔ ان کی ہر خواہش پوری کرتے ہیں۔ بچپن کی پھولی چھولی چیزوں سے لے کر بڑے ہو کر تعلیم تک کے معاملے میں انہیں پوری آزادی دیتے ہیں۔ وہ جو پروفیشن چاہے اختیار کریں، چھٹی چاہے کر سکیں۔ دوسروں کے سامنے فخر سے بتاتے ہیں کہ ہمارے گھر میں بچوں پر کوئی روک ٹوک نہیں۔ انہیں ہر طرح کی آزادی حاصل ہے۔ پھر جب ہمارے بچے اس آزادی کے عادی ہو جاتے ہیں انہیں اپنے فیصلے خود کرنے کی عادت ہو جاتی ہے۔ وہ خود اپنا اچھا برا سوچنے کے قابل ہو جاتے ہیں تو ان کی زندگی کے سب سے اہم فیصلے کے وقت اچانک ہی ہم ان سے تمام اختیارات اور آزادیاں واپس لے لیتے ہیں اور جو ہماری اولاد ایسا کرنے سے انکار کر دے تو اس پر خود سری اور نافرمانی کا الزام لگاتے ہیں دیر نہیں کرتے۔"

وہ نیکی پر سر رکھ کر لیٹے ہوئے چھت کی طرف

تھا۔ تم نے دل میں کیا سوچا ہو گا کہ میرے پاپا کتنے ظالم ہیں۔ مگر نہیں تم اپنے دل میں بھی میرے خلاف کوئی خیال نہیں لاتی ہو گی۔ میری خاطر چپ چاپ خود کو قربان کر رہی تھیں اور میں خاموش کھڑا سب دیکھے جا رہا تھا۔ مگر میری جان تمہارے آنکھ سے بہنے والا ہر آنسو میرے دل پر گر رہا تھا۔ میں تمہیں تمہاری سب خوشیاں لوٹاؤں گا نہاد اور اگر ایسا نہ کر سکا تو خود کو بھی معاف نہیں کروں گا۔ اب میری بیٹی کے کیوں پر بھی جھوٹی مسکراتی نہیں ہے گی۔ وہ اپنے دل کی پوری آمادگی کے ساتھ مسکرا رہی تھیں۔ ایسی مسکراہٹ جس میں اس کی آنکھیں اس کی ہنسی کا ساتھ دے رہی ہوں گی۔

اپنی آنکھوں سے گرنے والے اشکوں کو اٹھاتی سے خشک کرتے ہوئے وہ تہہ کی نماز کے لیے اٹھ گئے تھے۔ وہ دعا مانگتے میں مشغول تھے جب اوزان نے دروازے پر دستک دی تھی۔ اسے جواب دے کر جائے نماز پر گئے وہ کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ کمرے کا دروازہ نیمواکیے کھڑا ہوا ان کا انتظار کر رہا تھا۔
"لگتا ہے آپ رات سوئے نہیں؟" انہیں ڈانٹتے روم میں لے کر آتے ہوئے اس نے تشویش سے پوچھا تھا۔
"ہاں بس نیند نہیں آتی۔" وہ اس کے تشویش بھرے انداز پر ہنسنا مسکرائے تھے۔
"آپ سحری میں کیا لیں گے؟ رات کو مجھے پوچھنا یاد ہی نہیں رہا۔" ملازم کو ٹیبل پر لوازمات رکھتے دیکھ کر وہ کچھ شرمندگی سے بولا تھا۔
"میری ایسی کوئی خاص ڈش نہیں ہوتی سحری میں جو کچھ بھی ہے مناسب ہے۔" وہ اسے اطمینان دلاتے ہوئے بولے تھے۔ گردن ہلاتے ہوئے اس نے ان کے آگے پلیٹ رکھی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ انہیں مختلف ڈشز پیش کر رہا تھا۔
"اچھا آپ تھوڑا سا دودھ ہی لے لیں۔" انہیں بہت جلدی باتھ روکنا دیکھ کر وہ اپنا بیٹ سے بولا تھا۔
اس کے کہنے ہی انہیں نہاد کی فصاحت بھی یاد آئی تھی

اگر وہ میری جان میری باری بیٹی! ایک بیٹی ہونے کے لیے مجھے کیس کیس مقام پر مایوس نہیں کرنا پڑا۔ آپ ہونے کی حیثیت سے میں نے خود مایوس کیا ہے۔ جب ہم کسی پر حق رکھتے ہیں تو اسے اپنی باتھ کچھ فرائض بھی تو ہم پر عائد کرتے ہیں۔ مگر میری خوشیوں کے لیے ہونٹوں پر مسکراہٹ سہائے پھر رہی تھیں۔ مے اٹک جھٹک رہی تھیں اور میں اس سے بے خبر تو نہیں تھا۔ اس طرف سے نگاہیں پھیرے ہوئے

اس لیے فوراً ہی درود کے لیے ہائی بھر گئے تھے۔ سحری کے بعد وہ دونوں ساتھ ہی نماز پڑھنے گئے تھے۔ نماز پڑھ کر واپس آئے تو وہ گاڑی سے اترتا ہوا ان سے بولا۔

”آپ مجھے بہت جھکے ہوئے لگ رہے ہیں۔ تھوڑی دیر ضرور سو جائیں۔“ جواب میں انہوں نے یوں گردن ہلائی جی جیسے خود بھی یہی سوچے ہوئے تھے۔ کمرے میں آکر لیٹے تو واقعی نیند آگئی تھی۔ وہ بہت گہری نیند سوئے تھے۔ آنکھ کھلی تو کھڑی وہ پر کے پارہ بجا رہی تھی۔ منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلے تو ملازم جیسے انہیں کے انتظار میں کھڑا تھا۔ ان کے ہاتھ میں ایک رقعہ پکڑا کروہ خاموش کھڑا تھا۔

”آفس میں ایک ضروری کام ہے۔ تھوڑی دیر میں آجاؤں گا۔“ مختصر سی تحریر تھی۔ ملازم سے اخبار مانگنے کا ارادہ رکھتے تھے مگر اسے آخر پڑی نہیں آتی تھی اور وہ ترکی زبان سے نا آشنا۔ چارو ناچار خاموشی سے باہر لان میں آکر بیٹھ گئے تھے۔ سرویوں کی دھوپ بہت بجلی معلوم ہو رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ خود ہی ان کے لیے اخبار لے آیا تھا۔ اخبار پڑھ کر اندر آئے تو وہ ان کا کمرہ صاف ستھرا کیے اب استری کرنے کے لیے کپڑے مانگ رہا تھا۔ غالباً وہ اسے سب کچھ بریف کر کے کیا تھا۔

ڈھائی بجے وہ واپس آیا تو سیدھا انہیں کے کمرے میں آیا تھا۔

”صور میں آج جاتا نہیں۔ لیکن ایک آرجنٹ کام پڑ گیا تھا۔“ وہ معذرت خواہانہ لہجے میں بولا تھا۔ ”آپ بور تو نہیں ہوئے۔“ اس نے مزید دریافت کیا تھا۔ آپ کی بارہ وقتہ لگا کر نہیں پڑے تھے۔ وہ ان کے قہقہے کو عجیب سے دیکھ رہا تھا۔

”تم سے مل کر تو مجھے ایسا لگنے لگا ہے جیسے میں کوئی چھوٹا سا بچہ ہوں۔“ وہ بے تکلفانہ انداز میں ہنستے ہوئے بولے تھے۔ اس نے کچھ جھینپ کر نظریں جھکا لی تھیں۔

”مجھے تم اچھے لگے ہو اوزان۔“ وہ اچانک بے

اختیار ہو کر بول پڑے تھے۔ ”مجھے بھی آپ بہت اچھے لگے ہیں اور یہ تعریف میں اپنی تعریف کے جواب میں نہیں کر رہا بلکہ رائے ہی آپ سے یہ بات کہنا چاہتا تھا مگر جی بات تو یہ کہ میری بہت نہیں ہو رہی تھی۔“ وہ بڑی سچائی سے بولا تھا۔

”اچھا تو رات تم مجھ سے ڈر رہے تھے۔“ مسکرائے تھے۔

”ڈر نہیں رہا تھا لیکن ایک بھگ سی محسوس رہی تھی کہ پتا نہیں آپ کیا سوچیں۔ اصل میں نہا نے مجھے آپ کے بارے میں اتنی ساری باتیں بتائی تھیں کہ ملے بغیر ہی میں آپ کی بہت سی باتیں چلی گیا تھا۔ ملے بغیر ہی آپ مجھے اچھے لگنے لگے تھے۔“ ان کے پاس ہی بیٹھ پڑنے لگا تھا۔

”تم نے ابھی تک ایک بار بھی نہا کی خیریت نہیں پوچھی؟“ وہ اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے بولے تھے۔

”یہ یہ پوچھتے ہوئے بھی تمہیں ڈر لگ رہا ہے۔“ اپنی بات کے اختتام پر کھل کر مسکرائے تھے۔ ”ہاں یہ پوچھتے ہوئے تو میں واقعی ڈر رہا ہوں۔ آپ میرے پوچھنے بغیر ہی بتا دیں۔“ وہ پہلی بار ان سے بے تکلفانہ انداز میں پس کر بولا تھا۔

”وہ دبا گئی ہوئی ہے اپنی بہن کے پاس۔ اسے میرے یہاں آنے کا پتا نہیں۔ میں اس سے آفس کے کام سے ہٹا کر جانے کا جھوٹ بول کر یہاں آ ہوں۔“ وہ اسے تفصیل سے بتا رہے تھے۔

وہ ایک ہفتہ دوبارہ کرواپس آئی تو بایا پہلے ہی موجود تھے۔

”نکل ہی واپس آیا ہوں میں اور تمہارے بغیر سحری اور انتظار میں کوئی پرائیم نہیں ہوا۔“ وہ اس کے ناراضی بھرے انداز کے جواب میں اطمینان سے بولے تھے۔

”بایا! گھر میں کیا کوئی مہمان آیا تھا۔“ وہ یکن کی

”چھوٹو اسے کچھ نہیں ہو رہا تمہارے شاہی نگرہوں کو ذرا چل کر دیکھو تو سہی کہ کون آیا ہے۔“ بایا چمکتی ہوئی آواز میں بول رہے تھے۔ اس نے غور کیا کہ بایا آج بے تحاشا خوش نظر آ رہے ہیں۔ وہ اس کی سوچوں سے بے نیاز اسے ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے ڈرائنگ روم کی طرف لے آئے تھے۔

”کیا تم بوجھ سکتی ہو کہ اندر کون موجود ہے؟“ ڈرائنگ روم کے بند دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر وہ اس سے کسلی کھیلنے لگے تھے۔ وہ ہکا بکا ان کی شکل دیکھ رہی تھی۔ ان کے انداز میں بچوں کی سی شرارت اور خوشی تھی۔

”تمہاری آسانی کے لیے میں یہ بات بتا سکتا ہوں کہ وہ شخص تمہیں میرے بعد ساری دنیا میں سب سے اچھا لگتا ہے۔“ اس کا دل بے اختیار تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔

”بایا؟“ وہ ایک بل کو ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ کر کھانگنے والے انداز میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تھی۔ اسے اندر آتا دیکھ کر وہ صوفے سے اٹھ گیا تھا۔

”کیسی ہو نہا؟“ ایسا لگ رہا تھا وقت کی رفتار ختم ہوئی ہے۔ شاید وہ کوئی خواب دیکھ رہی تھی۔ اس نے بے اختیار اپنی آنکھیں زور سے بند کر کے دوبارہ کھولی تھیں۔ مگر سامنے کے منظر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ بلیک جینز اور گرے ٹی شرٹ میں وہ اپنی اسی جاندار مسکراہٹ سمیت اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے بے ساختہ سر ہچکے تھا کر بایا کی طرف دیکھا وہ اسی طرح دروازے کے پاس کھڑے مسکراتے ہوئے اس کی سمت دیکھ رہے تھے۔ وہ ایک دم مڑ کر بایا کی طرف آگئی تھی۔ وہ اس پل اپنی کوئی بھی کیفیت، سمجھ نہیں پائی تھی مگر اسے بے تحاشا روٹا آ رہا تھا۔ اس کی کیفیت سمجھتے ہوئے انہوں نے بے اختیار اس کا سراپے سینے سے لگا لیا تھا۔

”تم نے یہ کیسے سوچ لیا تھا میری جان لاکہ تمہارے

”اس نے نہیں بس آفس کے ایک دو لوگ۔“ وہ اس کی شانک دیکھتے ہوئے عام سے لہجے میں اپنے کمرے میں آئی تو بھی اسے اس کے علاوہ بھی کوئی آیا تھا۔ ہینڈ کی مار سے رخ کاٹ دیکھ کر وہ حیران ہی رہ گیا۔

”کمرے میں پھول آپ نے رکھے ہیں؟“ وہ مذاق اڑانے والے انداز میں بولا۔

”کیا ہاں؟ میں تو صبح سے تمہارے کمرے میں گیا ہی نہیں ہوں۔“ وہ لاپرواہی سے بولے تھے۔ وہ اسے صبح سویرے کراچی کی رہی تھی۔ کبھی کسی دوست کے گھر سے ملنے جاتی کبھی یہ سوچتی کہ شاید بایا میرے ساتھ مل کر رہتے ہیں۔ مگر رات جب وہ صوفے کے کنارے لیٹا تو اس رات وہ صبح گلاب اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اسے ایک عجیب سا احساس ہوا تھا۔ کوئی ہانوس کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اپنی سوچوں اور خیالات سے گہرا کر اٹھ بیٹھی تھی۔

”کیا کس طرح ہو سکتا ہے؟“ اس نے خود کو

”نہا! دراصل جلدی سے ڈرائنگ روم میں آؤ۔“ بایا اسے دروازے کی طرف مخاطب کرتے ہوئے کچن میں داخل ہوئے تھے۔

”اس وقت کون آ گیا۔“ میرے شاہی کٹڑے پر اب ہو جائیں گے۔“ چاند رات کو عید کے پلو ان کے سامنے پیش کیے۔ بے حد مصروف ہوا کرتی تھی اور اس میں کسی مہمان کی آمد اسے سخت ناگوار گزرتی

بابا ہمیں دکھ دے کر خوش رہ سکتے ہیں۔ دیکھو میں اسے واپس لے آیا ہوں۔ میں نے خود سے عہد کیا تھا اپنی بیٹی کو اس کی تمام خوشیاں اس عید پر ضرور لوٹاؤں گا۔ وہ چنگیوں سے رو رہی تھی اور وہ اس کا سر جھکاتے ہوئے سرگوشی کر رہے تھے۔ وہ بھی ان دونوں کے پاس آکر کھڑا ہو گیا تھا۔

”کتنی بری بات ہے تم اوزان سے ڈھنگ سے ملی بھی نہیں اور روئے کھڑی ہو گئیں۔ وہ بھی کیا سوچ رہا ہو گا کہ نہاد کو میرا آنا اتنا برا لگا ہے کہ میری شکل دیکھتے ہی رونے لگی ہے۔“

اس کی بات سنتے ہی اس نے فوراً اور اٹھایا تھا اور نظریں برابر میں کھڑے اس شخص سے ٹکرانی تھیں جسے اس نے گزرتے ہر لمحہ اور ہر لمبے عداوت کیا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔

”بابا! آپ تو کہہ رہے تھے کہ نہاد بہت زیادہ سنجیدہ اور مہجور ہو گئی ہے مجھے تو یہ بالکل بھی بدلی ہوئی نہیں لگی۔ دیکھیں کیسے بچوں کی طرح رو رہی ہے۔“ بابا اس کے کھنٹس پر ہنس پڑے تھے اور وہ اس کی بات سے زیادہ لفظ بابا پر حیران ہوئی تھی۔ وہ اتنی بے تکلفی سے ان سے مخاطب تھا جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔

”مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے بابا! یہ سب کیا ہے۔“ وہ اچانک بے بسی سے کہتی ان دونوں سے دور ہٹ گئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا وہ دونوں مل کر اسے زچ کرنے میں مصروف تھے۔ یوں جیسے اس کے ساتھ کوئی جکسل پل کھیلنا چاہتا تھا۔

”ہمیں کہہ کون رہا ہے کہ اپنی جھوٹے دماغ پر زیادہ زور ڈالو۔“ اوزان مسکراتا ہوا بولا تھا۔ ”نہاد مجھے لگ رہا ہے کہ تمہارے شاہی ٹکڑے جلتے ہوئے ٹکڑوں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔“ بابا ناک سے دھڑکتے ہوئے بولے۔

”کھموش دیکھ کر آتا ہوں۔“ وہ ڈراٹنگ روم سے نکل گئے تھے اس نے ان کی کوئی بھی بات سنی ہی نہیں تھی بس سر جھکائے کچھ سوچتی ابھی ہوئی کھڑی

”بیٹھ جاؤ نہاد۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر صوفے کی طرف آنا ہوا بولا تو وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ اس کی آنکھوں میں تیرتی ابھرنے والی ناراضی اور ان سب جذبات کے پیچھے چھپی خوشی کو مسکرایا تھا۔

”تم نے بالکل ٹھیک کہا تھا نہاد۔ بابا واقعی بہت اچھے ہیں اور ان جیسا اچھا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا تم سے مل کر اگر میں نے محبت کے حقیقی معنی پائے تھے تو بابا سے مل کر اپنے تمام کھوئے ہوئے رشتے دوبارہ پائے ہیں۔“

وہ اس کے برابر میں بیٹھا خوشی سے بھرپور لمحے میں بول رہا تھا اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر وہ بڑی امانت نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”تم تو میری جدائی میں پہلے سے کبھی زیادہ خوب صورت ہو گئی ہو۔“ وہ شرارتی لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ایک دم کچھ ندوس ہو کر وہ اپنے ہاتھ اس کی گرفت سے آزاد کرانے لگی تو وہ اسی شرارت بھری مسکراہٹ کے ساتھ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”آج یہ ہاتھ میں نے بابا کی اجازت سے تھامے ہیں لہذا پھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”چلو ابھی نہاد تمہارے شاہی ٹکڑے تو مرحوم و معذور ہو چکے۔ اب ان کی جگہ کچھ اور بنا لینا۔“ بابا کی تواڑ سنتے ہی فوراً اس کے ہاتھ چھوڑ کر وہ تھوڑا دور ہٹ کر بیٹھ گیا تھا۔ اب کی بار ہنسنے کی باری اس کی تھی۔ اسے کھلکھلا کر ہنسنے دیکھ کر وہ تھوڑا کھسیانا ہو کر سر کھچاتے ہوئے خود بھی ہنس رہا تھا۔

اندرواغل ہوتے ہی انہوں نے بیٹی کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی جو ایک طویل عرصے سے دیکھ نہیں پائے تھے تو دل ہی دل میں اپنے رب کا شکر ادا کیا پھر وہ ایک وقت ان دونوں سے مخاطب ہوئے۔

”چاند رات کو تم لوگ گھر پر کیا کر رہے ہو۔ جاؤ نہاد اوزان کو کراچی کے چاند رات کی رونقیں دکھا کر آؤ اور تم بھی ایک عدد شہوار قیص خرید لاؤ۔ جیتز اور لی

میں ان سے مخاطب ہوئے تو وہ ہنستے ہوئے اقرار کرتے تھے۔

”میں کبھی اس طرح دوسے پاؤں بھی آجاتی ہیں۔ بالکل اچانک۔“ پاؤں میں پرش ہونے سے وہ خود سے پوچھ رہی تھی۔ سرخ گلابوں کی تواڑ اس کے لب آپ ہی آپ مسکرا دیے تھے۔ ”تو نہیں ان سرخ گلابوں نے صبح کی تیار ہو کر بیٹھی۔“ وہ تیار ہو کر بیٹھی تھی تو آواز آئی کہ ”اچھا“۔ ”اچھا“ بولا گیا تھا۔ پورے گھر تک بابا کا لڑکھانہ۔ مجھے دیکھنا ہے کہ تمہاری تیار ہو گئی ہو۔“ وہ دوسری طرف سے آواز آئی کہ ”اچھا“۔ ”اچھا“ بولا گیا تھا۔ پورے گھر تک بابا کا لڑکھانہ۔

”آج یہ ہاتھ میں نے بابا کی اجازت سے تھامے ہیں لہذا پھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”چلو ابھی نہاد تمہارے شاہی ٹکڑے تو مرحوم و معذور ہو چکے۔ اب ان کی جگہ کچھ اور بنا لینا۔“ بابا کی تواڑ سنتے ہی فوراً اس کے ہاتھ چھوڑ کر وہ تھوڑا دور ہٹ کر بیٹھ گیا تھا۔ اب کی بار ہنسنے کی باری اس کی تھی۔ اسے کھلکھلا کر ہنسنے دیکھ کر وہ تھوڑا کھسیانا ہو کر سر کھچاتے ہوئے خود بھی ہنس رہا تھا۔

”آج یہ ہاتھ میں نے بابا کی اجازت سے تھامے ہیں لہذا پھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

بابا کی بے شمار عیدیں تھیں۔ نہاد اور اوزان غنچیلوں بھری ایسی ہزاروں عیدیں ایک دوسرے کے تنگ منامیں۔

ان دونوں کی واپسی سے پہلے انہیں اپنے چارے دوست احمد کو بھی فون کرنا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ احمد بھائی اور سب سے بڑھ کر سکندر کے ساتھ وہ بہت بڑی زیادتی کر گئے ہیں۔ وہ ان سب سے معذرت کرنے کے لیے تیار تھے۔ خاص طور پر سکندر سے وہ بہت شرمندہ تھے۔ بہترین شرمندگی اس شرمندگی سے تو بہر حال کم تھی جو وہ اس جیسے چارے لڑکے کو ایک ایسی لڑکی کے ساتھ منسوب کروا کر کرتے جو اسے اپنی زندگی میں تو جگہ دے دیتی مگر اپنے دل میں کبھی نہیں۔

عمران ڈائجسٹ کے مقبول سلسلے
جن کا آپ کو بچپنی سے انتظار تھا
(اب کتابی صوت میں شائع ہو گئے ہیں)

مہارانی ایک جہان کی کہانی جس نے
تہلکہ مچا رکھا تھا کوئی بھی افسانے کے دائرے
بہرے۔ سننا تھا۔ سہ حصوں پر مشتمل ہے۔
پراسرار علوم کا ماہر ایک پراسرار شخص کی
دستان اس کی اپنی زبان سے مکمل کتاب

چمپا کلی تھالی کی طرح جہاں کی بے جہاں
تنتوں کو تار تار اور کیا کیا گل کھولائے۔
مکمل ایک کتاب۔

مہاراجہ و مشیر سے زیادہ خوفناک تھا۔
ایک عبرتناک داستان۔ ضرور پڑھیے۔
ایک کتاب میں مکمل۔

کتبہ عمران ڈائجسٹ ۲۴۔ اڈوڈر کراچی